تالیف

آیت اللہ شہید سید دستغیب شیرازی

ترجمہ

مولانا ریاض حسین جعفری فاضل قم

ادارہ منہاج الصالحین لاہور

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
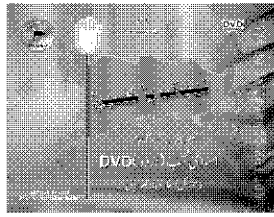
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

سورہ قمر کی ایمان افروز تفسیر

نصائح

مولف

شہید محراب آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب شیرازی

مترجم

مولانا ریاض حسین جعفری فاضل قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین جناح ٹاؤن ٹھوکر نیاز بیگ ملتان روڈ لاہور فون: 5425372

نام کتاب .... نصائح

مصنف .... آیت اللہ سید دستغیب

مترجم .... مولانا ریاض حسین جعفری فاضل قم

پروف ریڈنگ .... مولوی غلام حبیب

تعداد 1000

ایڈیشن .... جنوری ۲۰۰۳ء

ہدیہ 165

ادارہ منہاج الصالحین

دکان نمبر 20 ' فسٹ فلور' الحمد مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اُردو بازار'

لاہور- فون: 7225252

فہرست

اظہار تشکر

ہم ڈاکٹر سید فرخ علی ولد سید احمد علی کے شکر گزار ہیں کہ جنہوں نے ترویج مکتب اہل بیتؑ کے لئے آیت اللہ سید دستغیب شیرازی کی سورہ قمر کی تفسیر پر مشتمل کتاب نصائح کی اشاعت کے لئے ادارہ کی معاونت فرمائی۔ پروردگار عالم بحق محمدؐ آل محمدؐ ڈاکٹر صاحب کو ہر قسم کی بلیات ارضی وسماوی سے محفوظ فرمائے۔ اور ان کی اس سعی جمیلہ کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول فرمائے۔ آمین

ملتمس

ادارہ منہاج الصالحین لاہور

حرف مترجم

آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب مدظلہ کی کی ہر تصیف بلند علمی معیار کی حامل ہوتی ہے۔ آپ نے تحریر و تقریر ہر دو میدانوں میں ید طوئی دکھایا۔ آپ نہایت معتبر، مستند اور منفرد محقق تھے۔ فقہ و اجتہاد کے ساتھ ساتھ آپ نے تفسیر قرآن مجید پر قلم اٹھایا تو ممتازِ جہاں تفسیر قرآں کے مؤلف کے طور پر سامنے آئے۔ ہمارے پیش نظر آپ کی مؤلفہ سورۂ قمر کی تصنیف لطیف ہے جو آپ کے علمی و معلوماتی دروس پر مشتمل ہے۔ قبلہ نے اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر میں تاریخ انبیاء کی اس قدر ورق گردانی کی ہے کہ طوفانِ نوح، اقوام، عاد و ثمود اور معجزات موسوی پر معلومات کے انبار لگا کر رکھ دیئے ہیں۔ ایک مختصر سورۂ قرآن کی اس قدر جامع اور وسیع تفسیر آپ ہی کا حصہ ہے۔

ہم نے سورۂ قمر کی اس تفسیر کو نصائح کے نام سے شائع کیا ہے کیونکہ اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ مختلف انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کو کس قدر وعظ و نصیحت کیا، لیکن ان کے قلوب و اذہان پر انکار کی مہریں ثبت ہو چکی تھیں، لہٰذا

وہ راہ ہدایت سے بے بہرہ ہی رہے۔ چند مومنین اور متقین کے علاوہ اکثریت گمراہ ہی رہی بلکہ الٹا اپنے ان محسنین کے درپے آزار ہو گئے۔ ان بدبختوں نے حضرت نوحؑ جیسے عظیم ناصح پیغمبر کو لہولہان کیا تو حضرت لوطؑ کی زندگی اجیرن کر دی۔ اور ناقہ صالحؑ جو خدا کی عظیم ترین نشانی اور معجزۂ پیغمبر تھا کو ذبح کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور حضرت موسیٰ کو بھی ان کی قوم نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور ان کی پیروی کی بجائے حجتوں سے کام لیا۔ یہ بدبخت ناعاقبت اندیش محسن کش تھے۔ جب ختمی مرتبتؐ کا زمانہ آیا تو آپؐ کی قوم نے بھی شرک کو چھوڑ کر توحید کو اپنانا گوارا نہ کیا۔ حتیٰ کہ آپؐ سے طرح طرح کے معجزات کے تقاضے کئے اور معجزۂ شق القمر کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے بلکہ اسے سحر اور جادو کا نام دیا۔

رسول معظم ان بد اندیشوں کے سلوک سے پریشان ہوئے تو اللہ جل جلالہ نے آپ کو گزشتہ پیغمبروںؑ کے حالات و واقعات کا حوالہ دے کر فرمایا کہ رسولوں کی ذمہ داری صرف میرے پیغام کو میری مخلوق تک پہنچانا ہے۔ آگے اس پیغام کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے اس کی اپنی قسمت، سورۂ مبارکہ القمر کی تفسیر میں قبلہ آقائے دستغیب نے معلومات کی ایک دنیا آباد کر دی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہر رطب و یابس کی خبر ہے ویسے ہی اس کی تفسیر وسعت علمی کی حامل ہونی چاہئے۔ ہم نے قبلہ کے اس عظیم کارنامے کو اردو دنیا میں متعارف کروانے اور اہل علم کی تشنگی بجھانے کے لئے اردو زبان میں ترجمہ کا ارادہ کیا۔ بہ توفیق ایزدی یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا اور آپ کے ہاتھوں میں ہے ہم اس کاوش میں کس قدر کامیاب ہوئے یہ فیصلہ آپ پر

چھوڑتے ہیں۔

کتاب ہذا کی تصحیح کے لئے پروفیسر مظہر عباس صاحب نے بطور مصحح جو خدمات انجام دیں ان پر ہم تہہ دل سے پروفیسر صاحب کے ممنون ہیں۔ پروف ریڈنگ اور حوالہ جات کو چیک کرنے کے لئے شیخ خادم حسین اور مولوی حبیب اللہ کی توفیقات میں اضافے کے لئے دعا گوں ہوں۔

علامہ ریاض حسین جعفری
سرپرست ادارہ منہاج الصالحین لاہور۔

حرفِ نصیحت

خداوند عالم قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

اے اہل ایمان اگر تم تقویٰ کو اختیار کرو تو خدا اسے تمہارے لئے فرقان قرار دے گا۔ یعنی بصیرت والی دید اور شناخت عطا کرے گا تاکہ تم سعادت اور عدم سعادت کی مصلحتوں اور مفسدوں کو پہچان سکو۔ ایک اور آیہ مبارکہ میں ہے کہ صاحب تقویٰ بنو تاکہ علوم کو تم پر نازل کیا جائے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اگرچہ قرآن تمام لوگوں کے لئے نازل ہوا ہے لیکن وہ صرف متقی ہی ہیں جو ہدایت پاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن عام لوگوں کے لئے بیان ہے او اہل تقویٰ کے لئے ہدایت و نصیحت۔ یوں تو قرآن کی ہر سورہ وعظ و نصیحت کا خزانہ ہے لیکن سورۂ قمر تو خصوصاً مجموعۂ نصائح ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں متعدد انبیاء کے واقعات و معجزات کا ذکر کرنے کے بعد انسان کی رشد و ہدایت کے لئے پند و نصائح سے کام لیا گیا ہے، تاکہ انسان عبرت حاصل کرے اور شعائر اللہ کا انکار کر کے اپنی عاقبت

بردباد نہ کرے۔

ختمی مرتبت کا معجزۂ شق القمر ایک عظیم اور منفرد معجزہ ہے۔ جب مشرکین نے ختمی مرتبت رسول اسلام سے ایک کھلے میدان میں بیٹھے چاند کی چاندنی کا نظارہ کرتے ہوئے اسی حسین منظر سے سحر زدہ ہو کر کہا کہ اگر آپ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں تو اس چاند کے دو ٹکڑے کر دیں۔ دست نبوت کی انگلی کے ایک اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا اور آپ کی بغلوں کو بوسہ دیتے ہوئے پھر اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔لیکن نہ ماننے والے منکرین توحید و رسالت پھر بھی نہ مانے اور لگے علم نجوم سے حجت آرائیاں کرے۔ یہ عقل کے اندھے کیا جانیں کہ سورج کو واپس پلٹانے والا یہ حبیب خداؐ اگر چاہے تو کائنات کا نظام بدل کر رکھ دے۔ چاند کو دو ٹکڑے کرنا اس عظیم ہستی کے لئے بھلا کیا مشکل ہے۔قدیم تواریخ کے مطابق مالا بار کے راجے نے اس معجزۂ شق القمر کی گواہی دی ہے۔ اور جدید سائنس دانوں نے چاند پر قدم رکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے۔

ع   کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

جب ایک عام بشر کی چاند تک رسائی ممکن ہے تو سید البشر، باعث تخلیق کائنات رسولؐ کے اشارۂ انگشت سے معجزۂ شق القمر کیا بعید ہے۔

سورۂ مبارکہ القمر میں انبیائے ماقبل مثلاً حضرت نوح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور ان کی امتوں کے ان کے واضح معجزات کو جھٹلانے اور حقیقت کو دیکھ کر مکر جانے کا تذکرہ بھی نہایت ناصحانہ

انداز میں کیا گیا ہے۔ جس سے نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ میرے حبیب آپ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور انکار حقیقت سے دل تنگ نہ ہوں۔ ان سے پہلی امتوں نے بھی اسی طرح کیا اور نشانہ عذابِ خداوندی بنیں۔ کشتیٔ نوحؑ، ناقہ صالحہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لاتعداد معجزات کو دیکھنے سے بھی ان قوموں کو ناسمجھ افراد پر کچھ اثر نہ ہوا۔ سبق حاصل کیا تو صرف متقیوں نے اور نصائح یقیناً انہی کے لئے ہیں جن کے دلوں پر مہریں، آنکھوں پر پردے اور کانوں پر پہرے نہ ہوں۔ ورنہ کج فہم، کور باطن اور بخت انسان کہاں سمجھتے ہیں، وہ تو جہنم کے راہی اور لقمۂ تباہی ہیں۔ چاند روشن ہے اس کا دولخت ہونا بھی روز روشن کی طرح روشن ہے لیکن یہ روشنی حقیقت صرف اہل ایمان اور صاحبان تقوی کے لیے ہے۔ بے ایمان اور معصیت زدہ حیوان نما انسان تو طوفان نوح کی طغیانی پہاڑ، سے ناقہ کی برآمدگی اور خوراک میں مینڈکوں کی فراوانی سے بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔

سورۂ القمر کی تفاسیر تو سینکڑوں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی لیکن مفسر قرآن حضرت آیت اللہ دستغیب شیرازی نے جس عالمانہ انداز اور ناصحانہ طریقے سے یہ ذمہ داری نبھائی ہے وہ نہایت ہی قابل فخر کارنامہ ہے۔ جبکہ حجتہ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری صاحب نے اس کارواں دواں اور سلیس اردو ترجمہ کرکے اردو کے قارئین پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ قرآن ذریعہ نصیحت و عبرت ہے۔ اس سے بہترین نصائح کا کہیں ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ہم نے سورۂ القمر کے ترجمے کا نام اسی لئے نصائح رکھا ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ رب العزت

آغا صاحب کی علمی، اشاعتی اور نشریاتی توفیقات میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ وہ جس انہماک اور تن دہی سے خدمتِ علم دین میں مصروف ہیں وہ انہیں دورِ حاضر کے علماء میں ممتاز مقام عطا کرتے ہیں ۔ ایک ہی وقت میں لکھنا پڑھنا، تحقیق و تدقیق کرنا اور نشر و اشاعت کی ذمہ داریاں نبھانا کارِ آسان نہیں ہے۔ ادارہ منہاج الصالحین کا چند سالہ اشاعتی سفر علم و عمل کا ایک کارواں اپنے ہمراہ لئے ہوئے ہے۔ اس کارواں کی خیر و سلامتی اور فلاح و ترقی قائم آل محمدؑ کے ظہور پرنور تک نہایت ضروری ہے۔ یہ صالحینؑ کے راستہ پر گامزن قافلہ ہے اور صالحین کے آخر الزمان بقیۃ اللہ ہی اس ادارے کی بہتری کے ضامن ہیں۔ دعائے ظہور ولی العصر کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

پروفیسر مظہر عباس

ویسٹ منسٹر کالج لاہور

باسم رب العزت

محوِ علم و عمل ریاض حسین

علم انبیاء کا ورثہ اور عمل علم کا اثاثہ ہے۔ یہ دنیا دار العلم بھی ہے اور دار العمل بھی۔ گویا علم و عمل لازم و ملزوم ہیں۔ بے علم بے معرفت ہوتا ہے۔ اور بے عمل بے وقعت اور علماء کی بے عملی تو کسی صورت بھی قابل قبول نہیں۔ روزِ قیامت بے عمل خطیبوں کی زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جائیں گی۔ اور یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی کے پاس جس قدر علم ہو اسی قدر اس علم پر عمل کرنا صاحب علم کے لئے ضروری ہے۔ علم کے لئے عمل زینت ہے اور بے عملی باعث خفت۔ یا باالفاظ دیگر علم عمل کے بغیر بے کار اور باعث عار ہے۔ صد شکر کہ آج کے اس پر آشوب مادی دور میں بھی کچھ لوگ مینارہ ہائے علم و عمل کی صورت میں موجود ہیں انہی علمائے میں سے ایک برادرم علامہ ریاض حسین جعفری ہیں۔ جو بیسوں کتب کے مولف و مترجم باعمل عالم دین ہیں۔

علامہ موصوف لاہور شہر کے ایک کونے میں بیٹھے خدمت مذہب حقہ میں مصروف ہیں۔ مصائب آل محمد کی مستند اور تہلکہ خیز کتاب ''سوگنامۂ آلِ محمد'' کے

خوبصورت ترجمے کے بعد سورہ القمر کے ترجمہ وتفسیر پر مبنی کتاب ''القمر اور سورۂ واقعہ کے ترجمہ وتفسیر کی حامل کتاب ''دار الآخرہ'' کے تراجم انہوں نے ''نصائح'' اور ''جنت'' کے نام سے پیش کر کے بہت بڑی علمی خدمت انجام دی ہے۔ مستقبل قریب میں ان کے تعاون سے الوقائع و الحوادث جیسی ضخیم معلوماتی کتاب کی تقریباً آٹھ جلدوں کے تراجم کی آمد آمد ہے۔ ماضی میں ان کی سوالاً جواباً کتب کی مقبولیت نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور اب وہ مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں۔ علمائے دہلی ولکھنو کی کتب کی تسہیل وتجدید ان کے زیر کار ایک اور منصوبہ ہے اس طرح بحر المصائب' نہر المصائب' اخبار ماتم اور مجالس علویہ کی کئی جلدیں بھی عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔

قوم سے جعفری صاحب کی صحت وسلامتی کی دعا اور بھرپور تعاون کی اپیل ہے۔تاکہ یکصد سے زیادہ کتب کے اس ناشر کبیر کا مشن مزید آگے بڑھ سکے اور ادارہ منہاج الصالحین کے پلیٹ فارم سے تبلیغ اسلام اور فروغ تشیع کی خوب خدمت ہو سکے۔ ہم برادرم جعفری صاحب کی توفیقات میں اضافے کے لئے دعا گو ہیں۔

سیدہ صدف نقوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن مجید کی یہ سب سے عالی قدر، جلیل المرتبت اور بزرگ ترین آیت ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اسم اعظم سے نزدیک تر ہے۔

قَالَ الرِّضَا عَلَیۡہِ السَّلَام: اِنَّھَا اَقۡرَبُ اِلٰی اِسۡمِ اللّٰہِ الۡاَعۡظَمِ مَنۡ نَاظَرَ اِلٰی بَیَاضِھَا (لئالی الاخبار)

بہ الفاظ دیگر اگر اس آیۂ وافی ھدایہ کی اصل شرائط اور حالات یک جا ہو جائیں تو اس میں اسم اعظم کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کُلُّ اَمۡرِ ذِیۡ بَالٍ لَمۡ یُبۡدَا بِبِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ فَھُوَ اَبۡتَر "کَافِیۡ"

"ہر وہ کام جس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہ کیا جائے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتا"

چنانچہ ہر کام یا کسی مہم کا اچھا اور نیک انجام اس بات سے مشروط ہے کہ اس کام یا مہم کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا جائے۔

صادقِ آل محمدؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"لا تَدَعۡھَا وَلَوۡ فِیۡ شِعۡرٍ" (کافی)

"اگرچہ کوئی شعر پڑھنا چاہیں تو شروع میں بسم اللہ ...... کا پڑھنا ترک نہ کریں۔

یہ عالی شان آیت نقصان سے بچاتی ہے

کتاب لئالی الاخبار میں منقول ہے کہ ایک روز حضرت علی علیہ السلام منبر پر تشریف فرما تھے اور حاضرین سے فرما رہے تھے کہ! اگر کوئی شخص کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا کہنا ترک نہیں کرتا تو میں اس امر کا ضامن ہوں کہ وہ کھانا اسے کوئی نقصان یا ضرر نہیں پہنچا سکتا'' حاضرین میں سے ''ابن کوا'' نامی ایک شخص جو منافق تھا اور سینہ میں حضرت علی علیہ السلام کے خلاف بغض و کینہ رکھتا تھا' اس دوران پوچھتا ہے !میں نے کل رات کھانا کھانے سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھی لیکن اس کھانے کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہوگئی آپ نے فرمایا:

فَلَعَلَّکَ اَکَلْتَ اَلْوَاناً فَسَمَّیْتَ عَلٰی بَعْضِهَا وَلَمْ تُسَمِّ عَلٰی بَعْضٍ (لئالی الاخبار)

''ممکن ہے کل رات تم نے ایک ہی قسم کا کھانا نہ کھایا ہو اور اگر تم چاہتے ہو کہ کھانے سے تمہیں کوئی نقصان نہ ہو تو ہر نئے کھانے سے پہلے بسم اللہ کہو۔''

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ ہر نیا کھانا کھانے سے قبل ''بسم اللہ'' کہے۔

ایک اور روایت کے مطابق کسی شخص نے صادقِ آلِ محمدؑ کی خدمت میں عرض کیا ''میں کھانا کھاتے ہوئے بار بار بسم اللہ کہتا ہوں لیکن مجھے اس کے باوجود نقصان ہوتا ہے'' آپ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا:

اِذَا قَطَعتِ التَّسمِیَۃُ بِالْکَلَامِ ثُمَّ عَدتَ بِالْکَلَامِ تُسَمّیٰ

قُلْتُ لاَ قَالَ عَلَيْهِ السَّلاَمَ فَمَنْ هٰهُنَا يَضُرُّكَ (لئالی الاخبار)

''شاید تم آغاز میں بسم اللہ کہتے ہو اور کھانا کھانے کے دوران
کوئی بات کرتے ہو چنانچہ بات کرنے کے بعد پھر ''بسم اللہ''
کہا کرو تاکہ اس کی تاثیر باقی رہے۔''

اللہ تعالیٰ کے نام کی یہ برکت بھی ہے کہ شیطان مردود و لعین کھانا کھانے کے دوران اس شخص سے دور رہتا ہے جو کھانا کھانے میں مصروف ہے اور اس کے کھانا کھانے کے دوران اس کے ساتھ کھانا کھانے میں شریک نہیں ہوتا بلکہ بسم اللہ کی برکت سے وہ اس سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ میاں بیوی کو ہم بستری کے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا کہنا نہیں بھولنا چاہیے' کیونکہ قرآنی آیات مبارکہ کا متن اس امر کا شاھد ہے کہ شیطان مردود من جملہ مال و اولاد میں بھی شریک ہوتا ہے' اس سلسلے میں اللہ تبارک وتعالی قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

''وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ'' (بنی اسرائیل آیت ۶۴)

''اور ان کے مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا کر لے اور
شریک ہوتا رہ اور ان سے (خوب جھوٹے) وعدے کر۔''

ہر حالت میں بسم اللہ ...... کو وردِ زباں بنالیں

الغرض اس مبارک آیت کا وہ عالی شان مرتبہ ہے کہ مومنین ہر قسم کے حالات میں اس کو اپنا وردِ زباں بنائیں اور کسی بھی صورت میں اسے ترک نہ کریں اور یاد رکھیں بلکہ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیہ شریفہ کے ترک

کرنے سے نقصان کا اندیشہ موجود ہے۔

آسمان ولایت کے گیارہویں درخشاں ستارے یعنی حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَرُبَّمَا تَرَکَ بَعْضُ شِيعَتِنَا فِي افْتِتَاحِ اَمْرِهِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ فَيَمْتَحِنُهُ اللّٰهُ بِمَكْرُوْهٍ لِيُنَبِّهَهُ عَلٰى شُكْرِ اللّٰهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ ...... (لئالی الاخبار)

''اللہ تعالیٰ ہمارے بعض شیعوں کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ترک کرنے کی وجہ سے امتحان میں مبتلا کرتا ہے' تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں اور باادب ہو جائیں۔''

اب رہی بات دوسروں کی' خواہ وہ بسم اللہ پڑھتے ہیں یا نہیں' ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن چونکہ اہل بیت علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دوست داروں سے زیادہ انس و محبت ہے' اس لیے انہیں تنبیہ کی جاتی ہے تا کہ اس طرح وہ اپنے تئیں زیادہ فکر مند رہیں اور اپنی حفاظت کر سکیں اور اللہ کا پاک و بابرکت نام ان کا ورد زباں بنا رہے اور ہر نئے کام کے آغاز میں بسم اللہ...... کا پڑھنا ان کی عادت ثانیہ بن جائے۔

بسم اللہ نہ پڑھی اور زمین پر گر گیا

ایک دن عبداللہ بن یحییٰ' حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قریب ہی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی آپ نے اس صحابی سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے فرمایا۔ یہ صاحب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کرسی کے الٹ جانے کے سبب زمین پر گر گئے' جس کے باعث ان کا سر زخمی ہوا اور سر سے خون جاری ہو گیا اس موقع پر امیر

المومنین حضرت علی علیہ السلام نے پانی لانے کا حکم دیا اور آپ نے اس پانی سے اپنے صحابی کا سر دھویا۔ پھر اس سے فرمایا:

''میرے قریب آؤ'' آپ نے اپنا دست مبارک اس کے سر کے زخم پر رکھا اور اپنا لعابِ دھن اسی کے سر کے زخم پر ملا' اس لمحہ صحابی کے سر کا زخم ٹھیک ہو گیا اور اس زخم کا معمولی نشان بھی باقی نہ رہا۔ بعد میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا اے عبداللہ! خداوند کا شکر بجالا کہ ہمیں اپنے شیعوں اور اپنے چاہنے والوں کے گناہوں کو مٹانے کا دار دنیا میں ذریعہ قرار دیا اور ہم کو دنیاوی آلام و مصائب سے بچانے کے لیے مقرر فرمایا تا کہ ان کی اطاعت ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک و مبرا رہے اور اس کے بدلہ میں انہیں نیکیوں سے نوازا جائے۔

اس موقع پر عبداللہ نے عرض کی: اے میرے مولا! جس گناہ کے باعث میں زمین پر گرا وہ کون سا گناہ تھا' مجھے اس بارے میں آگاہ فرمائیں تا کہ آئندہ ایسا گناہ مجھ سے سرزد نہ ہو۔

حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

(فَقَالَ تَرَکَكَ حِیْنَ جَلَسْتَ اَنْ تَقُوْلَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم فَعَجَّلَ ذٰلِکَ لِسَهُوِکَ عَمَّا نَدَبْتَ اِلَیْهِ تَمْحِیْصًا بِمَا اَصَابَکَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ حَدَّثَنِیْ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰی کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُذْکَرْ فِیْهِ بِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرُ) (تفسیر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام۔)

''اس کا سبب یہ تھا کہ تم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بسم اللہ نہ پڑھی چنانچہ اس کی سزا تم نے پالی کیونکہ تمہیں جس چیز کے پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا' تم نے اس کا ورد نہ کیا' جس کے پڑھنے کے باعث تمہارے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سامنے ایک حدیث بیان فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کے ذریعے یہ خبر دی ہے کہ ہر وہ کام جس کا آغاز بسم اللہ کے ذکر سے نہ ہو تو اس کا انجام نہیں ہوتا۔''

روز قیامت مومنین کے نامہ اعمال کی حالت

ایک روایت میں منقول ہے کہ قیامت کے دن جب بندہ مومن کو اس کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا اور اس سے یہ کہا جائے گا کہ اسے پڑھ' تو مومن اپنی دنیاوی عادت کے مطابق کہ جب بھی وہ کوئی نئی چیز کو پڑھتا تھا تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا کرتا تھا حسب عادت اپنے نامہ اعمال کو پڑھنے سے قبل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے گا' اس طرح اچانک اس کے نامہ اعمال سے اس کے تمام گناہ مٹ جائیں گے اور الٰہی ندا آئے گی کہ اے ہمارے بندے! تو نے ہمیں رحمانیت اور رحیمیت سے پکارا ہے' اب ہم بھی تیرے ساتھ اپنی رحمت سے سلوک اور حساب و کتاب کریں گے ارشادِ خداوندی ہے:

اِقْرَاْ کِتَابَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا .

''اور ہم اس سے کہیں گے کہ اپنا نامۂ عمل پڑھ لے اور آج اپنا

حساب لینے کے لیے تو آپ ہی کافی ہے'' (بنی اسرائیل آیت ۱۴)

کاش کہ ہماری یہ عادت ثانیہ بن جائے اور تادم مرگ بھی ہم بسم اللہ ...... کہتے ہوئے دار فانی کو وداع کہیں اور جب قبر سے ہم ایک بار پھر زندہ اٹھائے جائیں تو بسم اللہ اور الحمد للہ ہمارا ورد زباں ہو: آمین!

وقالوا اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (۷۴-زمر)

''اور یہ لوگ کہیں گے شکر ہے جس نے اپنا وعدہ ہم کو سچ کر دکھایا''

کفن میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا رقعہ رکھنے کی سفارش

ایک بزرگوار شخص کا تذکرہ ہے کہ اس نے حالت احتضار بوقت مرگ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی آیت شریفہ کو ایک رقعہ پر لکھا اور یہ وصیت کی کہ اس رقعہ کو میرے کفن میں رکھنا تاکہ میں یہ کہہ سکوں کہ میرے پالنے والے کہ تیری کتاب کی سب سے پہلی آیت قرآن مجید کی ہر سورۂ مبارکہ کا پہلا عنوان قرار پایا ہے۔ اے میرے رب! اے میرے پالنے والے! میرے ساتھ اس آیت کے مطابق سلوک فرمانا یعنی رحیمیت اور رحمانیت کی صفت کے ساتھ میرا حساب و کتاب فرمانا (لئالی الاخبار)

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

''اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب، خدا ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔ (سورۂ انعام ۔ ۱۶۳)
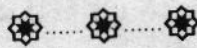
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قیامت قریب ہے

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ.

قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا"

"اَلسَّاعَۃ" قیامت کے ناموں میں سے ایک ہے اور پروردگار عالم نے قرآن مجید کے کئی مقامات پر اس نام سے قیامت کی تعبیر فرمائی ہے۔ "اِقۡتَرَاب" کا معنی و مفہوم بھی قریب آنے یا نزدیک ہونے کے مترادف ہے چنانچہ "اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ" کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت کی گھڑی قریب آ گئی۔

(اب ہم یہ غور کریں گے کہ قیامت کے سلسلے میں ساعت کی تعبیر سے کیوں استفادہ کیا گیا ہے؟)

ا۔ امر تسمیہ کی پہلی صورت

ساعت زمانہ یا وقت کی اکائیوں میں سے ایک اکائی ہے۔ اب چونکہ قیامت دنیاوی عمر کی گھڑیوں یا ساعات کی آخری گھڑی یا ساعت میں ظہور پذیر یا

واقع ہو گی اس لیے اسے ساعت یا گھڑی سے تعبیر کیا گیا ہے

۲۔ تسمیہ کی دوسری صورت

اس بارے میں بعض محققین کہتے ہیں! قیامت کو اس لیے ساعت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی طرف یا اس کی جانب سعی و حرکت کی جاتی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ لوگ فطری طور پر قیامت کی جانب مصروف سعی و حرکت ہیں۔ باوجودیکہ لوگ اس سمت کی جانب اپنی اس حرکت سے آگاہ نہیں اور یکسر غافل ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ایک ایک سانس کے ساتھ لوگ قیامت کے قریب ہوتے چلے جا رہے ہیں' اس لیے اس کو ساعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ تسمیہ کی تیسری صورت

ایک اور وجہ یہ ہے کہ یہاں پر ساعتوں یا گھڑیوں کا مسئلہ در پیش نہیں بلکہ کیونکہ قیامت کے روز عجیب و غریب واقعات رونما ہوں گے۔ منجملہ یہ کہ ایک طرف جہنم ایک لاکھ لگاموں میں مقید شعلہ ور ہو رہی ہوگی۔ اس طرح لوگوں کو دیگر قیامت کے خوفناک اور ہولناک مناظر دیکھنے میں آئیں گے اور مختصراً یہ کہ انتہائی مختصر وقت میں انتہائی عظیم واقعات پیش آئیں گے۔ اسی لیے اس روز کو ساعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۴۔ تسمیہ کی چوتھی صورت

ایک اور سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس امر سے روز قیامت حساب و کتاب کے عمل کا سرعت اور تیزی کے ساتھ انجام پانے کی جانب اشارہ ہو۔ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ سریع الحساب ہے یعنی تیزی سے حساب لینے والا خالق ہے اور اس کی

ذات والا صفات کے لیے آغاز خلقت سے قیامت تک آنے والی تمام مخلوق کے حساب میں کسی قسم کی تاخیر کا کوئی مفہوم نہیں لہٰذا اس سلسلے میں صریح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مومن کا حساب و کتاب ظہرین کی نمازوں کے درمیانی وقفہ میں مکمل ہو جائے گا چنانچہ مومن بروز حشر اتنی مختصر مدت میں اپنے حساب و کتاب سے فارغ ہو جائے گا بلکہ اگر یہ بات کہی جائے کہ اتنا عرصہ بھی درکار نہ ہوگا تو بے جا نہ ہوگا مومن کے سامنے ایک کتبہ ہوگا قرار پائے گا جس پر اس کے جملہ اعمال چاہے معمولی ہوں چاہے عظیم، اس کی عبادات اور معاصی و گناہ تمام کے تمام اس نہج پر نمایاں ہونگے کہ ایک لمحہ میں اس کا ادراک کرے گا اور ان سے واقف ہو جائے گا، لہٰذا قرآن نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا.

"اور کہتے جاتے ہیں ہائے ہماری شامت یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹے گناہ کو قلمبند کئے بغیر چھوڑتی ہے نہ بڑے گناہ کو"

(الکہف ـ ۴۹)

رسول اللہؐ فرماتے ہیں جب کوئی فرد اپنے گناہ کو دیکھے گا، تو فرطِ حزن و ملال سے پیپ اور خون کے آنسو روئے گا (بحار الانوار جلد ۷ صفحہ ۴۲)

وہ بذات خود اپنے گناہوں کا مشاہدہ کرے گا اور اس بات کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ اسے بتایا جائے کہ کن کن گناہوں کا مرتکب ہوا ہے بلکہ اسے خود ہی سب کچھ پڑھنا ہوگا، لہٰذا قرآن مجید نے اس کی وضاحت کی ہے:

اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا.

''اور ہم اس سے کہیں گے کہ اپنا نامہ عمل پڑھ لے اور آج اپنا حساب لینے کے لیے تو آپ ہی کافی ہے'' (بنی اسرائیل: آیت ۱۴)

فراموشی اور بھول دنیا کی خصوصیت ہے

جہان آخرت اس دنیا سے سراسر مختلف ہے۔ ہماری اس دنیا کا تو یہ حال ہے کہ اگر گزرے ہوئے دن میں کسی سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے، عین ممکن ہے آج کے دن وہ اس حماقت کو طاق نسیاں کے سپرد کر دے اور بتدریج اسے مکمل طور پر بھول جائے لیکن روز قیامت کا معاملہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ زندگی کے آغاز سے تادم مرگ جملہ اعمال و افعال (معمولی اور غیر معمولی) تمام کے تمام اسے یاد آ جائیں گے، قرآن مجید نے اس کی یوں وضاحت فرمائی ہے:

وَوَجَدُوْا مَاعَمِلُوْا حَاضِرًا.

''اور جو کچھ ان لوگوں نے دنیا میں کیا تھا وہ سب لکھا ہوا موجود پائیں گے۔'' (الکھف، ۴۹)

وہ جہان یا عالم عجیب وغریب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے اسم ''سریع الحساب'' کا وہاں پر مکمل ظہور ہوگا، جی ہاں! قیامت کے روز ہی ابتدائے تخلیق کائنات سے لے کر دنیا کے فنا تک تمام کے تمام پیدا ہونے والے جن و بشر کا مکمل حساب لکھا ہوا موجود ہوگا اور جس جس نے جو بھی عمل کیا ہوگا، خالقِ کائنات ایک لحہ میں سامنے لے آئے گا۔ بہ الفاظ دیگر یہ سب کچھ وہم و خیال سے بالاتر انتہائی کم عرصہ میں واقع ہوگا اور اسی مناسبت سے قیامت لفظ ساعت سے تعبیر کی گئی ہے۔

حسَاب کی طوالت عذاب' الم اور صعوبت ہے

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض لوگوں کو بہ روز قیامت حساب کے مقام یا موقف پر طویل عرصہ تک روکا جائے گا' یعنی روز قیامت حساب کے پچاس مقام یا موقف ہیں اور ہر موقف پر ہزار سال تک روکا جائے گا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو حساب لینے والا ہے تیزی سے حساب لینے پر قادر نہیں بلکہ اس تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص نجات پانے والوں میں سے ہوگا اور ہر مقام پر طوالت حساب کے نتیجہ میں اسے عذاب ہوگا اور اذیت لاحق ہوگی اور اس عمل کے ذریعہ وہ گناہوں سے پاک و پاکیزہ ہو جائے گا۔ جبکہ اگر نجات پانے والوں میں سے نہیں ہوگا تو ان مواقف میں طوالت حساب سے اس کو شدید عذاب اور اذیت وصعوبت کا سامنا کرنا پڑے گا جو بذات خود اس کے لیے ایک قسم کی سزا ہوگی۔

بعض اہل ایمان افراد کے گناہوں کی اسی دنیا میں تلافی ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں سے پاک ہو کر دار فانی سے کوچ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیماری یا کسی طویل علالت یا شدید جان کنی کے نتیجہ میں یا انتقال کے بعد فشار قبر اور عالم برزخ کے عذاب کے باعث تمام اہل ایمان افراد کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایسے افراد کو قیامت کے روز کسی مقام یا موقف پر حساب کی طوالت کی اذیتوں' اور عذابوں اور صعوبتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن اگر خدانخواستہ عالم برزخ میں بھی گناہوں کی کثرت کے باعث اسے معافی نصیب نہیں ہوتی تو قیامت کے مختلف مقامات ومواقف میں اسے روکا جائے گا' یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر پاک و

پاکیزہ ہو جائے۔ نیز اگر اس کے باوجود وہ گناہوں سے پاک نہ ہوا تو اسے حساب کے مقام پر طویل عرصہ تک ٹھہرنا ہوگا اور اگر اس کے گناہ اس سے بھی زیادہ ہوئے تو اسے کچھ عرصہ جہنم کا عذاب برداشت کرنا ہوگا اور تمام گناہوں کے اثرات زائل ہونے پر وہ جہنم سے نجات پائے گا۔

قرب قیامت

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ قیامت ضرور برپا ہوگی اور یہ امر برحق ہے لیکن جو بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور جس کے بارے میں قرآن مجید میں بارہا یاد دہانی کرائی گئی ہے اور مومنین کو بالخصوص اسے یاد رکھنا چاہیے وہ قرب قیامت ہے۔ درحقیقت مخلوق خداوندی تمام تر گناہوں کا ارتکاب اس لیے کرتی چلی آ رہی ہے کہ وہ اس بات سے یعنی قرب قیامت کے مسئلہ سے غافل ہے اور قیامت کی آمد کو بہت دور سمجھتی ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّھُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا وَّ نَرٰہُ قَرِیْبًا.

قیامت ان کی نگاہ میں بہت دور ہے اور ہماری نظر میں نزدیک ہے۔'' (المعارج ۶' ۷)

خدانخواستہ سرے سے قیامت کی آمد کے انکاری ہیں۔ اس طرح ایسے لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''آیا کوئی شخص اس جہاں سے آ کر اس کے بارے میں کوئی خبر لایا ہے؟'' ایسے لوگوں کے شعور و ادراک کی سطح اتنی ہی ہے۔ کیا یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ انبیاء برحق ؑ نے آ کر انہیں یہ باتیں نہیں بتائیں اور ایسے معاملات کے بارے میں انہیں آگاہ نہیں فرمایا؟ کیا حضورِ ختمی مرتبت ؐ کا

تمام جہانوں پر احاطہ نہیں تھا؟ اور آپؐ نے قیامت کے واقعات سے انہیں روشناس نہیں فرمایا؟ اس کے باوجود ان تمام باتوں سے قطع نظر کیا اللہ تبارک تعالیٰ نے قرآن کریم میں قیامت کے حالات کے بارے میں بار بار انہیں مطلع نہیں فرمایا؟

سورۂ مبارکہ نجم کی آخری آیات میں ارشاد خداوندی ہے:

''اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ''

قیامت قریب آ گئی ہے۔ (نجم۔ ۵۷)

یہاں پر بھی قرب قیامت کی جانب اشارہ ہے۔ اسی طرح سورۂ انبیاء کی ابتداء میں ارشاد ہوتا ہے:

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ.

یعنی ''لوگوں کے پاس ان کے حساب کا وقت آ پہنچا ہے اور وہ ہیں کہ غفلت میں پڑے منہ موڑے ہی جاتے ہیں۔'' (انبیاء۱)

ایسا کام کرو کہ اسے پڑھنے میں شرمندگی نہ ہو

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

'' جو کام کرنا چاہتے ہو، جو بات کہنا چاہتے ہو ایسی ہو کہ کل (بہ روز حشر) اسے پڑھنے میں تمہیں خفت نہ اٹھانی پڑے۔''

کیا آپ کے لیے یہ بات ممکن ہے کہ کل (روز حشر) یہ بات پڑھ سکو کہ میں نے فلاں موقع پر دشنام طرازی کی تھی، اور فلاں موقع پر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا اور فلاں دن کوئی برا فعل انجام دیا تھا؟ لہٰذا اگر ایسا ممکن نہیں تو کیوں اس بارے میں ابھی سے نہیں سوچتے؟

ایک نیک خصلت اور صالح انسان نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: میری تم سے ایک گزارش ہے۔ بیٹے نے جواب میں کہا آپ جو بھی فرمائیں گے میں وہی بجالاؤں گا۔ باپ نے کہا جب تم رات کو گھر لوٹ کر آؤ تو گھر سے باہر اپنے کئے ہوئے تمام اعمال و افعال کے بارے میں مجھے آگاہ کرنا۔ بیٹے نے باپ کی بات قبول کی اور جب وہ رات کو اپنے گھر لوٹا تو گھر سے باہر کے کئے ہوئے اپنے عام افعال و اعمال کے بارے میں اپنے والد کو آگاہ کرنا شروع کیا اور جب نازیبا باتوں اور برے افعال کی نوبت آئی تو اپنے والد کے سامنے بیان کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور شرمندگی محسوس کی چنانچہ اس نے اپنے والد کے ہاتھ پر بوسہ دے کر آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا: ’’بابا جان! آپ اس مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں اور اس کے سوا آپ جو بھی حکم دیں گے میں بجالاؤں گا کیوں کہ مجھے آپ سے شرم آتی ہے۔ والد نے اپنے بیٹے سے کہا میرے بیٹے میں ایک ضعیف اور عاجز بندہ ہوں اور تمہیں مجھ سے شرم آتی ہے لیکن کل جبکہ تم خالق کائنات کی بارگاہ میں پیش کئے جاؤ گے تو اس وقت کیا کرو گے چنانچہ والد کی وعظ و نصیحت سے بھرپور اس گفتگو کے سبب بیٹا اپنے تمام گناہوں سے تائب ہو گیا۔

قرب قیامت کی نشانی

حضرت محمد مصطفیٰ خاتم الانبیاء والمرسلین ؐ کی بعثت مبارکہ قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اب جبکہ حضور ختمی مرتبت مبعوث بہ رسالت ہو چکے ہیں تو یہ آخر الزمان یا دنیا کی عمر کا اخری حصہ ہے اور دنیا قریب الاختتام ہے۔ حضور ختمی مرتبت ؐ کی ذات اقدس کا بذات خود ارشاد ہے ’’اللہ تعالیٰ نے دنیا کی عمر

مختصر کر دی ہے۔ یعنی روز قیامت جتنی عمر کہ جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ.

"جو کہ سیڑھیوں کا (یعنی آسمانوں کا) مالک ہے۔ (جن سیڑھیوں سے) فرشتے اور اہل ایمان کی روحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں اور وہ عذاب ایسے دن ہو گا جس کی مقدار (دنیا کے) پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔"

حضور ختمی مرتبتؐ فرماتے ہیں! اس قلیل مدت میں سے صرف کم وقت باقی رہ گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الدُّنْیَا کُلَّهَا قَلِیْلاً فَمَا بَقِیَ مِنْهَا قَلِیْلٌ مِنْ قَلِیْلٍ وَ مَثَلَ مَا بَقِیَ مِثْلُ الثَّعبِ اَیْ اَلْغَدِیْرِ شُرِبَ صَفْوُهٗ وَ بَقِیَ کَدْرُه. (تفسیر روح البیان)

لہٰذا انسان کو ہر طرح سے تیار رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ اسے اچانک قیامت کا سامنا کرنا پڑے، وہ اسے آ گھیرے اور اپنی لپیٹ میں لے لے۔ اس سلسلے میں ایک روایت منقول ہے کہ بازار میں خریداری میں مصروف شخص ابھی صرف کسی چیز کو لینے میں مصروف ہوگا اور اس چیز کے دکاندار کو دام ادا کر رہا ہوگا کہ قیامت آ جائے گی۔ پروردگار عالم نے سورۂ مبارکہ یٰسٓ میں بھی اس موضوع کی جانب اشارہ فرمایا ہے:

فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَةً وَّلَآ اِلٰٓی اَهْلِهِمْ یَرْجِعُوْنَ.

"پھر نہ تو یہ لوگ وصیت ہی کرنے پائیں گے اور نہ اپنے گھر

ہی کی طرف لوٹ کر جا سکیں گے۔" (یٰسٓ - ۵۰)

مالک دینار کی گفتگو

ایک دن مالک دینار کی بیٹی نے اپنے والد سے کہا: بابا! رات کے وقت آپ کو کیا ہو جاتا ہے کہ جب آپ پر معمولی نیند طاری ہوتی ہے تو آپ اچانک نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں؟ مالک دینار نے کہا بیٹی تمہارے باپ کو اس بات کا خدشہ رہتا ہے کہ وہ سو رہا ہو اور کوئی عذاب آ جائے۔ کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰىٓ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ.

"تو کیا ان بستیوں میں رہنے والے اس بات سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آ جائے جبکہ وہ پڑے (بے خبر) سوتے ہوں۔" (الاعراف - ۹۷)

موت قیامت صغریٰ ہے

قرآن مجید میں ساعت سے موت کی تعبیر کی گئی ہے اسی لیے موت کی گھڑی کو قیامت صغریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ موت قیامت کا آغاز، دار عمل کا اختتام اور عالم جزا کی ابتداء ہے۔ چنانچہ قیامت کبریٰ کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں موت کی گھڑی میں اس کی مثال ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قیامت کے دن ایک شدید زلزلہ واقع ہوگا جس کے نتیجہ میں دودھ پلانے والی مائیں ڈر کے مارے اپنے دودھ پیتے بچوں کو بھول جائیں گی اور ساری حاملہ عورتیں اپنے اپنے حمل دہشت سے گرا دیں گی (سورۂ حج کی ابتدائی آیات) اسی طرح موت کے

لمحات میں بھی انسانی جسم پر ایسا لرزہ طاری ہوتا ہے کہ روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے۔

قیامت وہ روز ہے جس روز ستارے بے نور ہو جائیں گے اور گر پڑیں گے۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انکَدَرَتْ

اور جس وقت تارے گر پڑیں گے۔ (التکویر-۲)

اس طرح موت کی ساعت میں بھی انسان اپنے تمام حواس کھو بیٹھتا ہے اور آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ درحقیقت ہماری آنکھیں اور کان تاروں کی طرح ہیں۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں لیکن اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا اور اس کے کان صحیح ہوتے ہیں لیکن کچھ سنائی نہیں دیتا۔ قیامت وہ دن ہے جس دن آفتاب کی چادر کو لپیٹ لیا جائے گا اور وہ بے نور ہو جائے گا۔ موت کی گھڑی میں بھی دل کا سورج ڈوبنے لگتا ہے اور اسے گہن لگ جاتا ہے اور اس کی حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ جدید طبی تحقیقات کے مطابق دل کی ساخت اتنی مضبوط ہے کہ اگر انتہائی طاقتور افراد بھی اسے مضبوطی سے جکڑ لیں تب بھی اس کی دھڑکن ختم نہیں ہوتی لیکن موت کے وقت قیامت کے دن کے سورج کی مانند ہمیشہ کے لیے ڈوب جاتا ہے اور اس کی دھڑکنیں رک جاتی ہیں۔ قیامت کے دن عظیم اور مضبوط پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے:

وَيَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَارَبِّىْ نَسْفًا.

''اور اے رسولؐ تم سے لوگ پوچھا کرتے ہیں پہاڑوں کا حال تو تم کہہ دو کہ میرا پروردگار انہیں بالکل ریزہ ریزہ کر کے

اڑا دے گا اور بکھیر دے گا'' (طٰہٰ-۱۰۵)

موت کی گھڑی میں بھی جسم کی انتہائی مضبوط ہڈیاں خستہ ہو جاتی ہیں اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو کر خاک میں یکساں ہو جاتی ہیں۔

زندگی کی بہار کو غنیمت سمجھنا

کیا کیا صورتیں پہناں ہو گئیں چنانچہ اس زندگی کی بہار سے جہاں تک ممکن ہے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمیں اپنے ان اعضا و جوارح سے جب تک طاقت ہے بیش از بیش فائدہ اٹھانا چاہیئے کیونکہ بہت جلد موت کی آندھی انہیں بکھیر دے گی۔

غنیمت سمجھ زندگی کی بہار
آنا نہ ہوگا یہاں بار بار

ہمیں تہجد گزاری کرنی چاہیئے' نماز شب میں طویل رکوع و سجود کو جب تک زندگی کی توانائیاں باقی ہیں نہیں بھولنا چاہیے کیونکہ عنقریب ہمارا یہ خاکی جسم بہت جلد خاک میں یکساں ہو جائے گا اور پھر اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر پائیں گے۔

حضور ختمی مرتبت ؐ کا ارشاد ہے:

''جب سوتا ہوں مجھے امید نہیں ہوتی کہ دوبارہ جاگ سکوں گا۔'' آپ ؐ نے حضرت ابوذرؓ سے ایک بار فرمایا کہ جب صبح کو نیند سے جاگتے ہو تو اس بات کی امید نہ رکھو کہ رات تک زندہ رہو گے۔

محمد ؐ و آل محمد ؑ سے مودت بہت بڑا سہارا ہے

بحار الانوار میں انس بن مالک سے منقول ہے کہ حضور ختمی مرتبت ؐ ایک

دن مسجد کے منبر پر رونق افروز تھے کہ ایک بادیہ نشین عرب مسجد میں داخل ہوا اور آپ کی خدمت میں عرض کیا یا محمدؐ! قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے اس بادیہ نشین عرب سے فرمایا:

تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ (آخرکار قیامت آ جائے گی لیکن تم نے اس دن کے لیے کیا عمل پیش کیا ہے؟) بادیہ نشین عرب نے جواب دیا میں نے قیامت کے دن کے لیے نہ زیادہ نمازیں اور نہ روزے پیش کئے ہیں، صرف آپؐ سے محبت رکھتا ہوں۔ حضور رحمۃ اللعالمینؐ نے فرمایا:

''جو کوئی جس سے محبت رکھتا ہے اسی کے ساتھ محشور ہوگا۔''

اس طرح ہر شخص جس چیز یا جس شخص سے پیار رکھتا ہے تو وہ چیز یا شخص اپنی مثالی شکل میں اس کے ساتھ محشور ہو گا۔ یقیناً ہمارے دلوں میں محمد و آل محمدؐ کی محبت و مودت کی جڑیں مضبوط ہیں۔ امید ہے یہ محبت ہمارا ساتھ دے گی۔ اس بات سے میری مراد یہ ہے کہ ہم بہت زیادہ پر امید ہیں لیکن موت سے لے کر روز قیامت تک یعنی میدان حشر میں محشور ہونے تک آنے والے تمام عقبات اور مقامات سے خائف ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں خدا کی رحمت اور محبت اہل بیت علیہم الصلوۃ والسلام کی امید بھی رکھنی چاہیے۔

شق القمر

قیامت کے قرب کی نشانیوں میں حضرت محمد مصطفیؐ کی بعثت ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ نیز چاند کا دو ٹکڑے ہونا منجملہ علامات قربِ قیامت ہے، یہ معجزہ حضور ختمی مرتبتؐ کی انگشت مبارک کے اشارے سے واقع ہوا۔

"انشق القمر" کے معنی یہ ہیں کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ سورۂ قمر کی یہ آیۂ مبارکہ اس مشہور و معروف اور تسلیم شدہ معجزہ کی جانب اشارہ کرتی ہے جس کو شیعہ اور سنی متفقہ طور پر مانتے ہیں، اور دونوں مذاہب کی کتب احادیث میں تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ معجزہ واقع ہو چکا ہے۔ ابتداء میں اس عظیم معجزے کے بارے میں کہ یہ معجزہ کیونکر واقع ہوا، کچھ واقعات بیان کئے جائیں گے اور بعد میں اس معجزہ کے منکرین کے شکوک و شبہات کے خلاف دلائل پیش کریں گے۔

محدثین اور مفسرین کے ایک گروہ نے جو کچھ اس معجزہ سے متعلق بیان کیا ہے اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک دن ابو جہل ایک شخص کے ہمراہ جو یہودی تھا حضورؐ کی خدمت میں آیا اور آپ سے جسارت آمیز اور گستاخانہ انداز میں گفتگو

کرتے ہوئے کہا کہ کب تک اپنی دعوت سے باز نہ آؤ گے؟ کب تک ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتے رہو گے' اگر آج جس بات کا ہم آپ سے مطالبہ کرنے آئے ہیں' پورا کر کے نہ دکھایا' تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔

آنحضورؐ نے دونوں افراد کے جواب مین فرمایا تم جو بھی چاہتے ہو اسے پورا کر دکھاؤں گا۔ اس موقع پر ابوجہل نے اپنے یہودی ساتھی سے مشورہ کیا کہ ہمیں ان سے کیا مطالبہ کرنا چاہیے۔ یہودی شخص نے کہا کہ زمین پر تو جادو کا کرشمہ دکھلایا جا سکتا ہے لیکن عالم علوی تصرف سحر و جادو کے دائرہ سے خارج ہے۔ چنانچہ ابوجہل حضورؐ کو مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا اگر آپؐ چاند کو دو ٹکڑے کر دکھائیں تو ہم آپ کی بیعت کر لیں گے اور ایمان لے آئیں گے۔ اس موقع پر آپؐ نے ان سے عہد لیا بلکہ بعض کے مطابق دوسرے عرب قبائل کے سرداروں نے بھی عہد کیا کہ اگر آپؐ نے کوئی ایسا معجزہ کر دکھایا وہ بھی آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس سلسلے میں قبیلہ قریش کے چودہ سرداروں نے یہ عہد کیا تھا۔ اس موقع پر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آسمان سے زمین پر تشریف لائے اور حضرت ختمی مرتبتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ پروردگار عالم فرما رہا ہے ہم نے افلاک پر آپ کا تصرف قائم کر دیا ہے اور آپ کے لیے مسخر کر دیئے ہیں اس لیے ان سے اس سلسلے میں میعاد لے لو۔ چنانچہ آپؐ نے چاند کی چودھویں شب کو جبکہ چاند بدر کامل ہوتا ہے' معجزہ دکھلانے کے لیے منتخب فرمایا۔

اس طرح چاند کی چودھویں شب آئی رات کا کچھ حصہ گزر چکا تھا' حضور ختمی مرتبتؐ ابوجہل اور دیگر مشرکین قریش کے ہمراہ کوہ ''ابوقبیس'' پر رونق افروز تھے۔ بیعت اور عہد کی ایک بار پھر یاد دھانی فرما کر کہ اگر چاند دو ٹکڑے ہو جائے تو

ایمان لانا ہوگا' اپنی انگشت مبارکہ سے چاند کی جانب اشارہ فرمایا اور وہ تعمیل حکم رسول اللہ ؐ دوٹکڑے ہوگیا۔ روایات کے مطابق چاند کا ایک حصہ اپنی جگہ قائم رہا اور دوسرا حصہ حرکت کرکے ایک فاصلہ پر جا کر ٹھہر گیا۔ چاند کے دونوں ٹکڑوں میں واقع فاصلہ کے بارے میں ابن مسعود سے مروی ہے کہ ''خداوند عالم کی قسم میں نے کوہ حرا کو چاند کے دونوں ٹکڑوں کے درمیان مشاہدہ کیا تھا'' بعض روایات کے مطابق حضرت شاہ ختم المرسلین ؐ نے ان لوگوں سے فرمایا:

کیا تم چاند کے دونوں ٹکڑے دیکھ رہے رہو؟ تو انہوں نے آپؐ سے کہا کہ دونوں ٹکڑوں کو دوبارہ بدر کامل بنا دیں۔ چنانچہ آپؐ نے ایک بار پھر انگشت مبارک سے چاند کے دوحصوں کی جانب اشارہ فرمایاوہ دونوں دوبارہ ایک دوسرے سے آ کر مل گئے۔ پھر آپؐ نے فرمایا تم اس بات پر گواہ تھے کہ چاند کے دوٹکڑے ہوئے لہٰذا میری رسالت پراب ایمان لے آؤ۔ اس طرح جس یہودی نے اس معجزہ کے بارے میں مشورہ دیا تھا بغیر چون و چرا کے آپ پر ایمان لے آیا' تاہم ابوجہل اور دیگر مشرکین جواس معجزہ کے شاہد تھے عہد شکنی کی اور ایمان نہ لائے۔ سوتے کوتو جگانا ممکن ہے لیکن جو شخص جاگ رہا ہو اور سونے کا انکار کر رہا ہو اسے کیونکر جگایا جا سکتا ہے۔ ایسے شخص کوتو آسمانی بجلی اور شدید گھٹاؤں کی گرج چمک نیند سے جگا نہیں سکتی۔

ابوجہل اور دیگر مشرکین تو آپؐ سے عناد رکھتے تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں ایمان لانے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے وہ آپؐ کی رسالت پر اس معجزہ کے بعد جو ان کی منشا کے مطابق دکھلایا گیا تھا ایمان لانے کے بجائے کہنے لگے شاید سحر و جادو کے ذریعے ہماری چشم بندی کی گئی ہو۔ آپؐ کچھ وقت منتظر رہیں تا کہ ہم ان

افراد ہے جو اس وقت مکۂ مکرمہ میں موجود نہیں اور حالت سفر میں ہیں' لوٹ آنے دیں تا کہ ان سے اس کے بارے میں سوال کریں اور اگر انہوں نے اس معجزہ کی تصدیق کر دی تو ہم آپؐ پر ایمان لے آئیں گے' تاہم جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں یہ بھی ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کا ایک انداز تھا اور ان کا بس نہ چلا اور ان کی خصومت کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ انجام کار وہ آپؐ پر ایمان نہ لائے۔

لب لباب یہ ہے کہ شق القمر کا معجزہ نہ صرف قرآن مجید کا ایک متن ہے بلکہ تمام مسلمانوں کی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور تمام مسلم راویان حدیث کے متواترات میں سے ہے۔

معجزہ شق القمر کے گوناگوں انداز بیاں اور تاویلیں

شق القمر کے معجزہ کے بارے میں جو بعض تفاصیل میری نظر سے گزری ہیں جو ظاہراً ناسخ التواریخ کے مصنف سے منقول ہے کسی اور کتاب میں میری نگاہ سے نہیں گزریں' کہا گیا ہے کہ "چاند کے دو ٹکڑے ہوئے اور دونوں ٹکڑے زمین پر آئے اور حضور ختمی مرتبتؐ کے گریباں میں داخل ہو کر پیرھن کی آستین سے خارج ہوئے۔ یہ بیان کسی بھی نہج پر احادیث اور روایات سے ثابت نہیں اور اس بات کے بارے میں حد امکان تحقیق و جستجو کے باوجود کسی بھی معتبر کتاب میں مجھے کوئی ثبوت نہیں دریافت ہوا۔ بحار الانوار کی چھٹی جلد میں شق القمر سے متعلق بیشتر روایات موجود ہیں اور اس قسم کا بیان ضعیف ترین روایت میں بھی نہیں ملتا۔ چنانچہ شق القمر کے سلسلے میں شیعہ و سنی روایان سے جو کچھ بھی نقل ہوا وہی ہے جس کی جانب ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں یعنی یہ امر مسلمہ اور متفق علیہ ہے کہ چاند کا ایک ٹکڑا اپنی ہی

جگہ پر قائم رہا جبکہ دوسرا ٹکڑا حرکت کرکے اس سے کچھ فاصلے پر جا کر ٹھہر گیا۔

مسافروں نے بھی شق القمر کا معجزہ دیکھا

مرحوم فخر الاسلام ''بیان الحق'' میں رقمطراز ہیں: تفسیر خازن میں جبیر بن مطعم سے منقول ہے کہ حضور پاک حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کے زمانے میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے جس پر قریش کے لوگ کہنے لگے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ؐ نے ہماری نگاہوں کو سحر و جادو سے متاثر کیا ہے جبکہ قریش کے بعض افراد روبہ سخن ہو کر کہنے لگے کہ اگر حضور ختمی مرتبت ؐ نے ہماری آنکھوں کو مسحور کیا ہے اور ان پر جادو کے کرشمہ سے اثر ڈالا ہے تو تمام لوگوں کی آنکھوں کو کیونکر اپنے سحر و جادو کے زیر اثر قرار دے سکتے ہیں۔

یہ روایت ترمذی میں منقول ہے، نیز دوسروں نے یہ روایات بھی نقل کی ہیں کہ قریش کے کفار لوٹنے والے مسافروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان سے اس رات میں چاند کی صورتحال کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور آنے والے مسافر یہی اظہار کرتے تھے کہ ہم نے اس رات چاند کے دو ٹکڑوں کا مشاہدہ کیا تاہم قریش کے کفار ان کے بیانات کو جھٹلاتے رہے۔

سیاروں کا ٹوٹنا اور جڑنا

جو لوگ اس معجزہ کے بارے میں شکوک و شبہات سے دو چار ہیں دراصل وہ قدیم فلاسفہ کے خیالات سے متاثر ہیں۔ قدیم فلاسفہ کا کہنا ہے کہ سیاروں کا ٹوٹنا یا دو ٹکڑے ہونا اور پھر سے جڑنا محالات بالا (علوی) کے سیارے یا ایسے پاکیزہ اجسام ہیں جو ٹکڑے ہو کر جڑتے نہیں، یہ بیانات حکماء و فلاسفہ یونان سے منقول ہیں

اور انہوں نے اپنے خیالات کے مطابق کچھ سیاروں کے بارے میں اپنا خاص تصور قائم کیا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر چاند کو اور سورج کو معقر اور محدب تصور کرتے تھے اور اس سلسلے میں ان کے ہاں کوئی برہان یا دلیل یا ثبوت بھی نہیں تھا وہ صرف اور صرف مفروضوں اور قیاس آرائیوں کو اپنے تصورات کی بنیاد قرار دیتے تھے۔

فلکیات اور سیاروں سے مربوط ماہرین کی جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ چاند اور سورج اور دیگر سیارگان کا ترکیبی مادہ ساخت کا مادہ وہی ہے جو کرۂ ارض کا ہے بلکہ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ چاند زمین سے جدا شدہ ایک ٹکڑا ہے لہٰذا ان کا دولخت ہونا اور جڑنا ممکنات میں سے ہے نیز پروردگار عالم کی قدرت کاملہ کے مقابلے میں سیاروں کا ٹوٹنا اور جڑنا کوئی انہونی بات نہیں ہے کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی رہ سکے۔

کیا شق القمر سب کو نظر آنا چاہیے؟

عیسائیوں نے بھی اس معجزہ کے بارے میں (چاند کا دو ٹکڑے ہونا) نیز مختلف شکوک وشبہات نقل کئے ہیں اور اپنی تصانیف میں خاص کر ان کی وہ تصانیف جن میں انہوں نے اسلام دشمنی کا پرچار کیا ہے، خصوصاً ''میزان الحق نامی ایک کتاب میں ''شق القمر'' سے متعلق اظہار کرتے ہیں کہ اگر چاند کے دو ٹکڑے ہوئے ہوتے تو دنیا کے تمام لوگوں کو نظر آتا۔ یورپ، چین اور ہندوستان کے تمام لوگوں کو نظر آتا۔ اور اس کی تاریخوں میں تذکرہ کیا جاتا جبکہ اسلامی کتب تاریخ کے علاوہ اس واقعہ (معجزہ) کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

اس سلسلے میں کئے جانے والے اعتراضات کے دیئے جانے والے جواب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ زمین گول ہے

زمین گیند کی مانند گول (کروی) ہے اور دنیا کے تمام ممالک اور شہر ایک افق پر واقع ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہمارے یہاں رات کی ایک گھڑی یا گھنٹہ گزر چکا ہو تو دوسرے مقامات (ممالک) میں رات کے چھ گھنٹے گذر چکے ہوتے ہیں جبکہ بعض ممالک ایسے بھی ہیں جہاں دن کے آغاز پر اختتام ہو رہا ہوتا ہے لہٰذا کرۂ زمین کے صرف ایک معمولی حصہ (ٹکڑے) کے لوگ اس وقت چاند کو دیکھ سکتے تھے۔

۲۔ فضاء میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے

دنیا کے مختلف ممالک اور شہروں کے موسمی حالات بھی ایک ہی وقت میں مختلف ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر بادل چھائے ہوتے ہیں یعنی بعض علاقے کا مطلع ابر آلود اور بعض کا جزوی طور پر ابر آلود اور بعض علاقوں کا مطلع بالکل صاف ہوتا ہے۔ چنانچہ چاند کی چودھویں رات کو جس رات میں حضور ختمی مرتبتؐ کی انگشت مبارک کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تھے دنیا کے کتنے شہر اور علاقے مقام معجزہ سے خواہ قریب واقع ہوں، خواہ دور اور خواہ معجزہ کے مقام کے افق پر ہی کیوں نہ واقع ہوں اگر تو اس رات وہاں مطلع ابر آلود ہو تو شق القمر کا مشاہدہ کیونکر ممکن تھا؟ نیز چاند کے دو ٹکڑے ہونے کی شب اگر بعض علاقوں کا مطلع غبار آلود ہو یا وہاں پر دھند چھائی ہوئی تھی تب بھی ان علاقوں میں شق القمر کے معجزہ کا مشاہدہ خارج از امکان تھا لہٰذا یہ دلیل کہ اگر شق القمر کا معجزہ رونما ہوا تھا تو دنیا کے تمام شہروں کے لوگوں کو نظر آنا چاہیے تھا، بے بنیاد ہے۔ نیز ان کو یہ خبر نہیں کہ

ہندوستان میں بھی لوگوں نے شق القمر کو دیکھا تھا جبکہ خود خدا نے سورۂ قمر میں اس واقعہ کو کس شدومد سے تفصیلاً بیان کر دیا ہے جس کے بعد شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ دراصل اس قسم کے بیانات نقل کرنے والا یا تو زمین کی گولائی (کروی شکل ہونا) اور محل وقوع کے لحاظ مختلف شہروں کے طول وعرض بلد اور اوقات و افق کے فرق سے مکمل طور پر نابلد اور ناواقف ہے اور صرف سطحی معلومات کی بنیاد پر اپنے دلائل پیش کیے ہیں اور اس موضوع کے بارے میں کسی قسم کی معلومات کا حامل نہیں اور یا ہٹ دھرمی اور عناد وخصومت کی بنیاد پر ایسے بیانات دینے پر مجبور ہے تاکہ بعض لوگوں کو حقائق سے برگشتہ اور گمراہ کر سکے، حالانکہ اس معجزے کے سلسلے میں شخصی طور پر یقین رکھتا ہوگا۔

۳۔ آسمانی واقعات و حالات پر تمام لوگ غور نہیں کرتے

عام طور سے جو واقعات و حالات آسمان پر رونما ہوتے ہیں اور خاص طور سے اگر یہ تبدیلیاں رات کے وقت واقع ہوں تو بہت کم افراد ان کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ آپ نے بذات خود اپنی تمام عمر کے دوران رونما ہونے والے متعدد جزوی اور مکمل چاند گرہن کا مشاہدہ نہ کیا ہوگا کیونکہ زیادہ تر لوگ اس موقع پر اور خاص طور پر موسم سرما کی سرد راتوں میں محو خواب ہوتے ہیں یا اپنے دنیاوی مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شق القمر کا واقعہ اچانک رونما ہوا تھا اور اصولی طور پر اس کے بارے میں تمام لوگوں کا باخبر ہونا خارج از امکان تھا۔ تاہم صرف وہی افراد اسے دیکھ سکتے تھے جو اس کے بارے میں پہلے سے مطلع ہونگے یا جنہوں نے آسمان کی جانب اچانک نگاہ کی

ہوگی۔ اس طرح چاند گرہن کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کی صورتحال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص جنتری پڑھتے ہوئے چاند گرہن واقع ہونے کی تاریخ اور وقت کے بارے میں آگاہ ہو جاتا ہے یا اچانک آسمان کی جانب نگاہ کرتا ہے تو وہ چاند گرہن کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اس لیے جو اناڑی اور نادان شخص یہ کہہ رہا ہے کہ اگر شق القمر کا معجزہ رونما ہوا تھا تو تمام لوگوں کو نظر آنا چاہیے تھا' اور تاریخ کی کتابوں میں تحریر ہونا چاہیے تھا اس کی بات عقلی دلائل پر مبنی نہیں ہے۔ نیز آپ نے بارہا آسمان پر کسی ٹوٹتے ہوئے ستارے کا مشاہدہ کیا ہوگا لیکن جب اگلے روز دیگر افراد سے اس کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو بیشتر لوگ ایسے واقعے کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شہر میں رہنے والے تین لاکھ افراد میں سے صرف ایک ہی فرد نے اس قسم کے واقعہ کا مشاہدہ کیا ہو لہٰذا اگر اس شہر کے دیگر تمام افراد نے ستارے کے ٹوٹنے کا واقعہ نہ دیکھا ہو تو یہ بات اس امر کی دلیل نہیں کہ واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔

۴۔ معاندین اور دشمنان اسلام' اسلام کی ترویج میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں

ان تمام باتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے عیسائی اور اس دور میں رائج ادیان و مذاہب کے پیروکار تمام کے تمام اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں ہمہ تن مصروف عمل تھے اور ہیں۔ چنانچہ اگر انہوں نے اس معجزہ کا مشاہدہ کیا بھی ہوگا یا اس کے بارے میں مطلع ہوئے ہوں گے۔ اس صورت میں بھی انہوں نے اس کی تصدیق نہیں کرنی تھی اور اپنی کتب تاریخ میں اس کا تذکرہ نہیں کرنا تھا کیونکہ وہ

ہمیشہ اسلام کی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے اور رہیں گے تا کہ اس کے چراغ کو گل کر سکیں۔ کیا شق القمر کے معجزہ کو جو اسلام کی حقانیت کی ایک بین اور واضح دلیل ہے اپنی تاریخ کی کتابوں میں درج کریں گے؟

۵۔ شق القمر کی روایت کے منکرین کے خلاف دلیل

مرحوم فخر الاسلام رقمطراز ہیں کہ ہندوستان میں ملیا بارد نامی ایک ریاست میں جہاں پر ایک پارسی (آتش پرست) راجا حکمران تھا' چاند کی چودھویں کی رات میں اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ شق القمر کے معجزہ کا مشاہدہ کرتا ہے۔اور یہ راجا چند افراد کو مذکورہ ریاست کے گردو نواح میں واقع مختلف علاقوں میں روانہ کرتا ہے تا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے بارے میں معلومات اکٹھی کر سکیں۔ چنانچہ جب راجا پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ رسول عربی حضور ختمی مرتبت ؐ نے مکہ مکرمہ میں اپنی رسالت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے یہ معجزہ دکھایا ہے مذکور راجا اور اس ریاست کے لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں۔ مرحوم فخر الاسلام آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ اس راجا نے شق القمر نامی ایک مسجد بھی اس ریاست میں تعمیر کرائی۔ (انیس الاعلام صفحہ ۱۰۹)

۶۔ کیا چاند زمین پر اتر آیا تھا؟

جس بات کا بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بعض روایات کے ظاہری مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ چاند زمین پر اتر آیا تھا لیکن مذکورہ احادیث پر غور و خوض کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چاند کے زمین پر اترنے کی تعبیر دراصل مجازی طور پر استعمال ہوئی ہے اور چاند کا حقیقی مفہوم میں زمین پر اترنا کسی صورت میں ان

احادیث سے ثابت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر تفسیر ''مجمع البیان'' میں اس سلسلے میں مختلف روایات نقل کی گئی ہیں۔

جبیر بن مطعم سے منقول ایک روایت کے مطابق راوی کہتا ہے کہ میں نے حضور ختمی مرتبتؐ کے حکم سے چاند کے دو ٹکڑے فلاں فلاں پہاڑیوں پر ہوتے ہوئے دیکھا (جس سے یہ قوی احتمال ہے کہ راوی نے کوہ صفا و مروہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔) روایت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ چاند کا ایک ٹکڑا ایک پہاڑی پر اور دوسرا ٹکڑا ایک اور پہاڑی پر اتر آیا تھا۔ لیکن روایت کے الفاظ کا حقیقی مفہوم یہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ راوی نے اس جہت اور سمت کی جانب اشارہ کیا ہے جہاں چاند کے دو ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ یہ بات بالکل ایسے ہے کہ ایک شخص جو مسجد الحرام میں کھڑا ہو اور شق القمر کے معجزے کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ کہے کہ چاند کا ایک ٹکڑا کوہ صفا کی پہاڑی پر اور دوسرا ٹکڑا کوہِ مروہ پر نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ لفظ ''پر'' کا مطلب پہاڑی کے اوپر کی سمت ہے نہ کہ چاند کا حقیقتاً پہاڑی پر اترنا۔

اسی طرح حضرت صادق آل محمدؑ سے نقل شدہ روایت میں بھی مجازی مفہوم بیان کیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ چاند کا ایک ٹکڑا کوہ صفا پر اور دوسرا ٹکڑا مشعر الحرام پر نظر آ رہا تھا یا مثال کے طور پر جب آپ رؤیت ہلال کی خصوصیات بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ چاند فلاں پہاڑی پر نظر آیا تھا۔ اس بات کا ہم نے اس لیے تذکرہ کیا ہے کہ مبادا بعض افراد کے لیے شق القمر کے اصل مفہوم کے بارے میں شکوک و شبہات وجود میں آئیں اور مختلف روایات کو پڑھنے کے بعد اصل مفہوم نہ سمجھ پائیں۔

معجزہ شق القمر اور قرب قیامت

یہاں پر ہم "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانشَقَّ الْقَمَرُ"۔

'قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔"

بعض وضاحتیں پیش کریں گے، اس سلسلے میں دو موضوعات کی جانب اشارہ کریں گے۔ پہلا موضوع یہ کہ سابقہ انبیاءؑ کے صحیفوں میں پروردگار عالم نے قیامت کی نشانیاں بیان کی ہیں اور فرمایا ہے کہ قیامت کی آمد سے قبل حضور ختمی مرتبتؐ مبعوث بہ رسالت ہوں گے اور شق القمر یعنی چاند کے دو ٹکڑے ہونا آپؐ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہوگا۔ چنانچہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شق القمر کا معجزہ قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

فخر رازی نے ایک دوسرے موضوع کو بیان کیا ہے۔ آپ یوں رقمطراز ہیں کہ پروردگار عالم نے قیامت کی علامات کے بارے میں سابقہ انبیاءؑ کے صحیفوں میں فرمایا ہے کہ سیارے، چاند سورج اور دیگر افلاک مضطرب ہو جائیں گے اور موجودہ دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ علم طبیعات کے ماہرین اور دہریہ افراد کہتے ہیں کہ آسمانی کواکب اور ستارے کسی صورت میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ تمام کے تمام لطیف اجسام ہیں اور انہیں توڑنے کے بعد جوڑا نہیں جا سکتا۔ بالفاظ دیگر وہ قدیم اور ازل سے موجود اجسام ہیں لہٰذا قیامت کا وجود نہیں کیونکہ تمام کواکب اور سیارگان ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوں گے، اسی لیے اللہ تبارک تعالیٰ کا یوں ارشاد ہوتا ہے:

"قیامت قریب آ چکی ہے اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے"

چنانچہ منکرین قیامت کے دلائل کو غلط ثابت کرنے کے لیے شق القمر کا معجزہ ایک عظیم برھان ہے۔ اس لیے یہ فرمایا گیا دیکھو چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے لہٰذا قیامت قریب آ چکی ہے' کیا چاند ٹوٹا نہیں؟ جبکہ کواکب اور سیاروں کی ٹوٹ پھوٹ قیامت کے قریب آنے کی نشانی ہے اور چاند بھی کواکب اور سیاروں کے مجموعے میں سے ایک کوکب ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے کتاب انیس الاعلام دیکھیں۔

قیامت کے حالات پیدا ہو چکے ہیں

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

"فَهَلْ يَنظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا"

''تو کیا یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ ان پر اک بارگی آ جائے گی اس کی نشانیاں آ ہی چکی ہیں۔''

یعنی کیونکہ حضور ختمی مرتبت مبعوث بہ رسالت ہو چکے ہیں اور شق القمر وغیرہ کے معجزات رونما ہو گئے ہیں اس لیے قیامت آنے کے حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ تفسیر بیضاوی' تفسیر کبیر فخر رازی اور کتاب جلالین نیز ملخص منہج کا خلاصہ میں بھی نقل کیا گیا ہے کہ قرب قیامت کی نشانیاں اور حالات جن کی جانب پروردگار عالم نے قرآن مجید میں اشارہ کیا ہے۔ حضور کا مبعوث بہ رسالت ہونا اور شق القمر کا معجزہ ہے۔

کفار و معاندین رسالت کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے

"وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ"

''اور اگر یہ کفار کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں' اور کہتے ہیں' یہ تو بڑا زبردست جادو ہے۔'' (القمر ۲)

کفار و معاندین نے حضور ختمی مرتبت ؑ سے چاند کو دو ٹکڑے کرنے کا معجزہ دکھلانے کا مطالبہ کیا' آپ ؐ نے شق القمر کا معجزہ انہیں دکھا دیا لیکن افسوس یہ کفار و معاندین تمام معجزات دیکھنے کے باوجود کہتے تھے کہ یہ تو تسلسل کے ساتھ زبردست جادو کر رہے ہیں اور اگر مشرکین کوئی آیت ''نشانی'' یعنی رسالت کی صداقت کی آیات اور معجزات دیکھتے تھے تو بجائے اس کے صداقت و سچائی کو تسلیم کریں' منہ پھیر لیتے اور اسے زبردست جادو قرار دے دیتے۔

چنانچہ اس قرآنی آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشرک لوگ آپ ؐ سے بار بار معجزات دکھلانے کا مطالبہ کرتے رہے اور جب آپ ؐ وہ معجزہ کر دکھاتے تو ایمان لانے کے بجائے وہ اسے جادو قرار دیتے اور اپنے معاندانہ رویہ پر قائم رہتے۔ ''لفظ مستمر'' کا دوسرا مفہوم مصدر ''مرور'' سے ماخوذ ہے یعنی شق القمر کا معجزہ ایسا جادو اور طلسماتی کرشمہ ہے جس کی تاثیر جلد ہی ختم ہو جائے گی جبکہ اس سے پہلے ان کا یہ خیال تھا کہ جادو آسمان پر کارگر نہیں ہو سکتا۔

جادو اور نبوت

مشرکین اور معاندین کو اتنا شعور و ادراک حاصل نہ تھا کہ جادوگر اور ساحر انتہائی برا شخص ہوتا ہے اسے صرف مال و جاہ دنیا ہی سے پیار ہوتا ہے اور اس کا خدا اور روحانی کمالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اور صرف شیاطین و جنات سے ربط رکھتا ہے کیونکہ سحر و جادو اور خدا سے دور رہنا لازم و ملزوم ہیں جبکہ حضور ختمی

مرتبتؐ توحید (لا الہ الا اللہ) کی صدا بلند کر کے ہمیشہ سے خدا اور اس کی وحدانیت کا اقرار فرما رہے تھے، اور لوگوں سے بھی یہی فرما رہے تھے وحدہ لاشریک کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اس لیے اسی الوہیت کا اقرار کرو کیونکہ تمام دیگر معبود جھوٹے تھے اور صرف اللہ ہی حقیقی اور سچا معبود و پروردگار ہے۔ جادوگر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کا ہدف اور مقصود طلب مال و جاہ اور نفسانی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے جبکہ حضور ختمی مرتبتؐ لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت کی جانب دعوت دے رہے تھے اور رات کو دس دس گھنٹے، صبح نمودار ہونے تک، حالت قیام میں گزار کر ذات واحدہ لاشریک کی بندگی میں بسر فرماتے۔ مشرکین اور معاندین اسی لیے رسالت کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ کیونکر حضرت محمد مصطفیٰؐ کا حکم مانیں۔ ابوجہل جس کا حقیقی نام ابوالحکم تھا، کہتا تھا کہ کیا ہم حضرت ختمی مرتبتؐ کی بات کو تسلیم کریں جبکہ وہ صرف اور صرف ایک یتیم شخص ہے۔ یہ مشرکین معجزات دیکھنے کے باوجود آپؐ کی رسالت کی صداقت و حقانیت کو نہیں مانتے تھے اور جو بھی ان کے منہ میں آتا کہہ دیتے اور آپ کے خلاف زبان درازی کے مرتکب ہوتے۔ باالفاظ دیگر وہ بہتان تراشی کرتے یا کسی اور گستاخی کے مرتکب ہوتے تھے اور وہ اصل حقائق سے بے بہرہ تھے۔ اسی لیے کہہ دیتے تھے کہ جادو کا مسلسل عمل جاری ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا اور یہ بھی علم نہ تھا کہ جادو اور شق القمر کے معجزے میں زمین آسمان کا فرق ہے اور دونوں کے درمیان کوئی وجہ تقابل موجود نہیں ہے۔ حضور ختمی مرتبتؐ کا بھلا جادو سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا؟

اسلام کا بول بالا ہوتا ہے

"وَ کَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْا اَھوَآءَ ھُمْ وَ کُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ"

''اور ان لوگوں نے جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور ہر کام کا وقت مقرر ہے۔'' (القمر۳)

اس آیہ مبارکہ میں لفظ ''مستقر'' کے متعدد مفہوم ہیں۔ اس لفظ کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ حضور ختمی مرتبت ؐ کی رسالت کو جو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا یہ صرف آغاز میں تھا لیکن انجام کار آپؐ کی اسلام کی جانب دعوت کامیاب ہوگی اور ایک ایسا وقت اور زمانہ آئے گا کہ مشرکین و معاندین کی یاوہ گوئی کی جانب کوئی بھی توجہ نہیں کرے گا۔ یہ وہ زمانہ ہوگا جب اسلام کے آفتاب کی دنیا کے گوشہ گوشہ میں ضوفشانی ہوگی، چنانچہ ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوا اور قلیل عرصہ میں مکہ، جو کل تک اسلام کے انتہائی مخالف مشرکوں کا مرکز تھا، حضور ختمی مرتبت ؐ کے ہاتھوں فتح ہوا اور بتدریج چین اور اسپین کے مشرق اور ایران و روم میں کلمات شہادتین کی صدائیں گونج اٹھیں اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں آپ انتہائی ادب و احترام کے ساتھ وحدہ لاشریک کے نام کے بعد آپ کا ذکر آئے گا۔

"يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ" (الصف :۸)

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اس لفظ یعنی ''مستقر'' کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ آخرت کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے یعنی یہ کبھی بھی اپنے وہم و گمان میں نہ لانا کہ کوئی عمل برا ہو یا اچھا ختم ہو

جائے گا اور بے نتیجہ ثابت ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ ہر امر اور کام کا اثر باقی رہے گا۔ جنہوں نے آپؐ کی رسالت کی تصدیق کی اور آپؐ پر ایمان لائے ان کا آخری مقام جنت ہوگا جبکہ مشرکین اور معاندین کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جہنم ہے۔

غافل لوگ اور ان کا حقیقی ٹھکانہ

سورۂ مبارکہ صف کی آیت ۸ کے بارے میں بعض علماء بیان کرتے ہیں کہ ''کفار'' سے مراد غافل لوگ ہیں۔ یعنی بعض لوگ قریب المرگ ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں بے نور ہو چکی ہوتیں ہیں اور قوت سماعت بھی کام چھوڑ چکی ہوتی ہے، دانت جدا ہو چکے ہوتے ہیں اور سر کے بال سفید ہو چکے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں آخرت کی منزل کی طرف جانے کی کوئی پروا نہیں ہوتی اور وہ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں ہمیشہ باقی رہیں گے اور اپنے آپ کو یہ تسلیم کرانے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا حقیقی مقام اور آخری ٹھکانہ کوئی اور جگہ ہے اور اس دنیا کی مثال صرف ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں سے صرف دوسری جانب عبور کرنا ہے۔ پروردگار عالم ہم سب کو خواب غفلت سے جاگنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

''پروردگار عالم! مجھے اس دنیا میں جو نفسانی خواہشات کے رنگوں سے بھرپور ہے اور جو آخرت کے لیے آمادہ ہونے کا مقام نہیں، خواب غفلت سے بیدار فرما، اور قفس عنصری سے جان نکلنے سے قبل مجھے موت کے لیے تیاری کرنے کے لیے توفیق مرحمت فرما۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے:

"وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِنَ الْاَنْبَآءِ مَافِيْهِ مُزْدَجَرٌ"

''اور ان کے پاس تو وہ حالات پہنچ چکے ہیں جن میں کافی تنبیہ تھی۔'' (القمر۴)

اس آیہ مبارکہ میں پروردگار عالم ان مشرکین کو سرزنش فرماتے ہوئے جو شق القمر کے معجزہ کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ایمان نہیں لائے اور تمام روشن دلیلوں اور نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود صرف اس لیے سر تسلیم خم نہیں کیا کیونکہ ان کی نفسانی خواہشات کی مخالفت ہوتی تھی اس لیے وہ ان معجزات کو جادو کہہ کر انکار کرتے رہے۔

اَنْبَاءُ ...... لفظ ''نَبَاء'' کی جمع کا صیغہ ہے اور اس کا مطلب وہ خبر ہے جو سودمند ہو۔ چنانچہ ہماری رائج عام خبریں مثال کے طور پر کہا جاتا ہے گزشتہ سال یہ ہوا اور وہ ہوا' انہیں خبریں کہتے ہیں لیکن ''نباء'' وہ خبر اور اطلاع ہے جس سے سننے والے کو بہت بڑا فائدہ ملتا ہے اور اس کی بھی دو اقسام ہیں: یا تو سابقہ واقعات سے مربوط ہوتی ہے تو اس سے عبرت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسے کسی شہر میں کئی سالوں پہلے کوئی وبائی بیماری پھیلی ہو تو اس کی خبر سے ہم عبرت حاصل کرتے ہیں' جس کے نتیجے میں ہمیں وبائی، بیماری کے آنے کے بارے میں شواہد ملتے ہیں اور آثار و واقعات و حالات سے بے حد فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ خبر کی دوسری قسم آئندہ یا مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات' مثال کے طور پر موت' عالم برزخ' قیامت' جنت اور دوزخ کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات ہیں اور قرآن مجید میں دوسری قسم کی معلومات اور اخبار کو نباء عظیم کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عَمَّ يَتَسَآئَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ

''یہ لوگ آپس میں کس چیز کا حال پوچھتے ہیں ایک بڑی خبر کا حال'' (سورۃ النبا۔۲،۱)

چنانچہ سورۂ قمر کی موضوع بحث آیت میں بھی پروردگار عالم کا ارشاد ہوتا ہے کہ ''اور ان کے پاس تو وہ انباء پہنچے ''بڑی خبریں'' ہیں جو ڈرانے اور عبرت حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ تاکہ گزشتہ اور مستقبل کے حالات سے باخبر ہو کر عبرت حاصل کر سکیں لفظ ''مزدجر'' کا مفہوم ڈرنا اور عبرت حاصل کرنا ہے لہٰذا ہمارے ہاں رائج عام خبریں جو ہم سنتے ہیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں کیونکہ اگر سچی خبریں ہیں تو وقت کا زیاں اور اگر جھوٹی ہوں تو ''سماعون للکذب'' یعنی جھوٹی باتیں سننے والے افراد کے زمرہ میں ہوں گے۔

انسانوں کی قیمتی عمر حقیقتاً چھوٹی ہے

جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فی زمانہ انسان کی اوسط عمر ساٹھ سے لے کر ستر سال تک ہے۔ سرور کونین حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ؐ نے اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ

اَکْثَرُ اَعْمَارِ اُمَّتِی بَیْنَ السِّنِیْنَ وَالسَّبْعِیْنَ

''یعنی میرے امتی زیادہ تر افراد کی عمر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہوگی۔''

کیا اتنی مختصر عمر کو لغو اور جھوٹی باتیں سن کر گزارنا دانشمندی ہے جبکہ اس قسم کی لغویات اور جھوٹ پر مبنی باتوں کا نتیجہ ماسوائے اس کے کہ فریب کارانہ تصورات کو جنم ملتا ہو' کچھ نہیں ہے' کیا اتنی قیمتی عمر کو بجائے اس کے ہم اسے فضول اور لا حاصل

گفتگو سننے اور کرنے میں صرف کریں بہتر نہیں کہ اسے قرآن' نصائح اور واقعات کا مطالعہ کرنے یا سننے میں صرف کریں؟ اس سے ہمیں دنیاوی اور اخروی فوائد حاصل ہوں گے کیونکہ ایک تو یہ کہ ہم دنیا کے فضول مشاغل میں مصروف ہو کر غافل نہیں ہوں گے اور دوسرے یہ کہ ہم ہمیشہ اخروی زندگی کے لیے زاد راہ تیار کرنے میں مصروف رہیں گے اور ہم اس دنیا سے خالی ہاتھ نہیں جائیں گے کیونکہ دنیاوی معاملات پر مبنی وحشت ناک اور خوفناک باتیں سننے سے ہمیں سوائے خوف و اضطراب لاحق ہونے اور غیر واقعی پریشانیوں میں اضافہ کے سوا کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح ہمارے خواب بھی انہیں فریب کارانہ باتوں پر مبنی ہوں گے۔ روز قیامت ہم سے یہ نہیں سوال کیا جائے گا کہ کون آیا اور کون گیا' کون صدر بنا اور کون کرسی صدارت سے محروم ہوا بلکہ قیامت کے روز یہ پوچھا جائے گا کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے' تم نے نمازیں ادا کیں یا نہیں۔ کیا تمہارا عقیدہ وہی ہے جس کی تمہیں تلقین کی گئی تھی یا نہیں۔ کیا تم نے حضور قلب کے ساتھ کبھی دو رکعت نماز ادا کی ہے یا نہیں؟

عمر کے قیمتی سرمایہ کو ضائع مت کریں

ہماری عمر کا وہی حصہ اہم ہے جو ہم نے یاد خدا میں گزارا یعنی جو عمر خدا اور اس کے محبوب بندوں کی یاد میں گزری ہو وہی حصہ خدا کی نگاہ میں اہم ہے کیونکہ عمر کے قیمتی سرمایہ کا بدل صرف جنت ہی ہے۔

"قِيمَةُ اَعْمَارِكُمُ الْجَنَة" (حدیث)

"تمہاری عمر کی قیمت جنت ہے۔"

لٰہذا اس قیمتی سرمایہ سے ہمیں گھاٹے کا سودا نہیں کرنا چاہیے اس سے ہمیں جنت کا سودا کرنا ہوگا۔ حور العین کا سودا کرنا ہوگا' قرب الٰہی کے حصول کے لیے کوششیں کریں' کیا عمر کے اس قیمتی سرمایہ کا غفلت اور لغویات کی خاطر ضائع کرنا افسوس ناک بات نہیں۔

"حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُر"

"انتہائی درجہ کی دانائی مگر ان کو تو ڈرانا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔" (القمر۔ ۵)

یہ تمام باتیں حکمت و دانائی سے بھرپور ہیں لیکن کونسی حکمت و دانائی؟ وہ انتہائی درجہ کی حکمت و دانائی ہے۔

حکمت کیا ہے؟ تفسیر اہل بیت علیہم السلام میں حکمت کے معنی علم و دانش کی حقیقت اور جوہر کو سمجھنا اور جاننا ہے' قرآن مجید کو جاننا اور سمجھنا ہے جس نے بھی قرآن مجید سے فائدہ حاصل کیا وہ حکیم و دانا ہے خواہ وہ دیگر علوم بھی نہ جانتا ہو اور اس کے برعکس اگر کوئی شخص قرآن مجید سے فائدہ حاصل نہیں کرتا' وہ درحقیقت جاہل اور نادان ہے' اگرچہ وہ فلسفی اور ڈاکٹر ہو۔ پروفیسر ہونا کچھ اور بات ہے' اس کا حکمت و دانائی سے کوئی واسطہ نہیں۔

علمی اور عملی حکمت و دانائی

حکمت کی دو اقسام ہیں' علمی اور عملی۔

اول: علمی حکمت یہ ہے کہ انسان بعض علوم سے روشناس ہو منجملہ یہ کہ انسان اپنی ذات کو ذلت وعبودیت کے ساتھ خدا کی عظمت سے واقف ہو' نیز انبیاء

کے مرتبہ اور خاص طور سے حضرت خاتم المرسلین محمد مصطفیٰ اور آپ کی عترت طاہرہ سے بھی روشناس ہو جائے۔ برزخ اور قیامت کے بارے یقین کا درجہ حاصل کرے اور یہ بھی جانے کہ جنت اور جہنم کا وجود ہے۔ دنیا کو فانی اور آخرت کو باقی اور جاوید جانے اور اشیاء کی حقیقت کے علم سے روشناس ہو جائے۔

دوئم: عملی حکمت یہ ہے کہ جن چیزوں کا علم حاصل کیا ہے اسے مقام شہود تک پہنچائے اور اس علم و دانش (جو اس نے حاصل کیا ہے) کے مطابق عمل کرے اور اپنے اعمال کا حساب کتاب رکھے' اس طرح اسے معلوم ہوتا جاتا ہے کہ حرص و لالچ اور بخیلی و کنجوسی ایک بری چیز ہے۔ نیز اسے یقین ہوتا ہے کہ کینہ اور دشمنی صفات مذمومہ ہیں چنانچہ اگر وہ محسوس کرے کہ بخل و کنجوسی یا حسد و کینہ اور حرص و لالچ کی مانند صفات اس میں موجود ہیں تو ان مذموم صفات سے نجات حاصل کرے۔

عین ممکن ہے کہ کوئی فرد علم اخلاقیات سے متعلق امور کا مطالعہ کر چکا ہو لیکن جب تک وہ اپنے نفسانی عیوب اور علتوں کی تشخیص نہ کر پائے اور ان نفسانی عیوب و بیماریوں کے معالجہ کے سلسلے میں قدم نہ اٹھائے تو اسے علم اخلاقیات کے حصول سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟

انہی صفات کمالیہ کے سلسلے میں یہی روش اختیار کرنی ہوگی چنانچہ جب خوف و امید نہ ہو یا وقار و سکون نہ ہو نیز منزل تسلیم و رضا کا شعور و ادراک نہ ہو تو اگرچہ ان صفات کے بارے میں کسی شخص کو مکمل علم حاصل ہو' تو اس کا اسے کیا فائدہ ہوگا۔ اور اسے حکمت و دانائی' نہیں کہا جائے گا۔ جب صحیح مفہوم میں حکمت و دانائی حاصل ہوگی تو علم و عمل سے آراستہ ہوگی۔

حکمت و دانائی کے اثرات

حکمت و دانائی سے متعلق امور کے سلسلہ میں اہل بیت اطہار علیہم السلام نے بعض علامات کی جانب اشارہ فرمایا ہے چنانچہ قرآن مجید کی مشہور آیۂ مبارکہ:

وَ آتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا.

''اور ہم نے انہیں بچپن ہی میں حکمت و دانائی عطا فرمائی''

(مریم۱۲)

کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں حکمت و دانائی سے متعلق امور کے اثرات دنیا میں زہد یعنی دنیا سے بے رغبتی ہے۔

یا آیۂ مبارکہ:

وَلَقَدْ آتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ

''اور یقیناً ہم نے لقمانؑ کو حکمت عطاء کی'' (لقمان۱۲)

کی تفسیر کے ضمن میں تفسیر صافی میں واضح کہا گیا ہے کہ اس دانا انسان میں حکمت و دانائی کی کئی علامات آشکار ہوئیں منجملہ ان علامات کے حضرت لقمان علیہ السلام حکیم اپنی پوری زندگی میں قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے کیونکہ ہنسی اور مذاق دل کو مردہ کرتی ہے۔

سورۂ لقمان میں حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

یٰابُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ.

(سورہ لقمان۔۱۳)

''اے بیٹا! خبردار کبھی کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ کیونکہ شرک یقیناً بڑا سخت گناہ ہے۔'' (سورہ لقمان ۔ ۱۳)

(جس کی بخشش نہیں) دوسروں سے بولنے میں اپنی آواز دھیمی رکھو اور اپنی چال ڈھال میں میانہ روی اختیار کرو' نہ اتنی تیز رفتاری سے چلو کہ تمہارا احترام اور وقار جاتا رہے اور نہ اتنی سست رفتاری سے چلو کہ لوگ کہیں کہ تم بیمار ہو۔ بیٹا اس بات کا خیال رہے کہ پروردگار عالم کا علم ہر چیز کا احاطہ کرتا ہے۔ تمہارا عمل چاہے کتنا معمولی ہو' رائی کے دانہ کے برابر اور کسی سخت پتھر یا آسمانوں یا زمین میں پنہاں کیا ہو خدا اسے قیامت کے دن حاضر کر دے گا۔

ان جامع اور مفید نصیحتوں کی مثالیں جنہیں پروردگار عالم قرآن مجید میں حضرت لقمان حکیم سے منسوب فرماتے ہوئے نقل کرتا ہے' تمام کی تمام حکمت و دانائی کا نتیجہ ہیں۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (البقرہ ۲۶۹)

''اور جس کو خدا کی طرف سے حکمت عطا کی گئی ہو تو اس میں شک نہیں کہ اسے خوبیوں کی بڑی دولت ہاتھ لگی''

حضرت لقمانؑ حکیم میں پائی جانے والی دوسری حکمت کی علامات میں آپ کا خاموش رہنا ہے۔ چنانچہ جو بھی حکمت و دانائی سے زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تر خاموش رہتا ہے چنانچہ خود کلام مجید بھی حکمت و دانائی کا مجسمہ ہے۔

قرآن مجید میں جو باتیں بتائی گئی ہیں تمام کی تمام انتہا درجہ کی دانائی کی باتیں ہیں لیکن افسوس:

فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ

''ان کو تو ڈرانا کچھ فائدہ نہیں دیتا''

اس آیۂ مبارکہ میں دو احتمال موجود ہیں۔ ایک یہ کہ استفہام انکاری ہے اور نذر ''نذیر'' کی جمع کا صیغہ ہے جس کے معنی ڈرانے والے کے ہیں۔ ان الفاظ سے دیگر انبیاء سے ملنے والی تمام تر معلومات کے باوجود ان کو کیا فائدہ حاصل ہوا؟ صرف مختصر افراد ہی نے ان کا اثر قبول کیا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''ما'' نفی کے لیے استعمال کیا گیا ہو چنانچہ اس کے مطابق آیت کا ترجمہ یہ ہوگا ''ان کو تو ڈرانا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو ڈرانے والے فرماتے تھے' لوگ اسے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ پروردگار عالم سے دعا گو ہیں کہ وعظ و نصیحت دلوں پر مرتب ہو تا کہ موثر ثابت ہو سکے۔

''فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ.''

''تو اے رسول! تم بھی ان سے کنارہ کش رہو''

اب جبکہ ان پر وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوتا اور انبیاءؑ کے ذریعے گزشتہ قوموں کی عبرت ناک داستانوں اور آنے والے مستقبل میں رونما ہونے والی ہیبت ناک حالات کے باوجود ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تو آپ بھی ان سے کنارہ کشی اختیار کرو۔

یہ بات واضح رہے کہ جب لوگ اپنی بیماریوں کی مجوزہ دواؤں کے استعمال سے لاپرواہی برتتے ہیں تو آخر کار حکیم بیمار سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اس لیے پروردگار عالم بھی اپنے پیارے رسول ؐ سے فرماتا ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ان سے کنارہ کش رہو۔

ناصح مشفق

عربی ادب کے مطابق فصاحت و بلاغت کا اصول یہ ہے کہ جب ناصح اپنے نصائح بیان کر دیتا ہے اور اس کی نصائح پر کوئی عمل نہیں کرتا اور اپنا منہ موڑ لیتا ہے، کیونکہ ناصح مشفق ہے تو روگردانی کے باوجود اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے نصائح سنے جائیں۔شاید سننے والے ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے بچ جائیں چنانچہ یہاں پر وہ کسی دوسرے کو اپنا مخاطب قرار دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتا ہے لیکن اس کا مقصد ان کو آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ یہاں پر خدا بھی اپنے رسولؐ کو مخاطب قرار دیتا ہے اور قیامت کے حالات سے اسے آگاہ کرتا ہے کہ شاید مشرکین اپنی غفلت کی نیند سے جاگ اٹھیں۔ ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

یَوۡمَ یَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیۡءٍ نُّکُرٍ.

''جس دن بلانے والا (اسرافیل) ایک اجنبی اور ناگوار چیز کی طرف بلائے گا''

یہاں پر داع کا مطلب بلانے والا ہے یعنی حضرت اسرافیلؑ جو ایک مقرب فرشتہ ہے اور صور پھونکنے کا فریضہ اسے سونپا گیا ہے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام تین بار صور پھونکیں گے، صور کی پہلی آواز خوف و دہشت کار ہوگی، دوسری آواز سے تمام کی تمام مخلوق موت کی نیند سو جائے گی اور تیسری آواز سے تمام مخلوق دوبارہ زندہ ہو جائے گی۔

جب حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کے لیے آسمان سے زمین پر تشریف لائیں گے تو تمام ملائکہ پر دہشت طاری ہو جائے گی۔ یہ فرشتہ بیت المقدس

(مسجد اقصیٰ) میں کھڑا ہوگا اور کعبہ معظمہ کی سمت اپنا رخ کرتے ہوئے صور پھونکے گا' اور صور سے ایسی آواز آئے گی جس سے زمین و آسمان کی ہر مخلوق پر دہشت طاری ہو جائے گی۔ اس کے بعد ایک دھواں ظاہر ہوگا۔ جس کی لپیٹ میں ساری کائنات آ جائے گی۔ (سورہ دخان کی آیت ۱۰ سے استفادہ کیا گیا ہے) اور مسلسل طور پر چالیس روز (دن رات) تک کرۂ ارض اس دھوئیں کی لپیٹ میں رہے گا۔ کفار تو سخت تکلیف میں رہیں گے کہ ان کی آنکھ' کان اور منہ سے دھواں نکلے گا' تاہم اہل ایمان اور صالح افراد ان تکالیف سے حفظ و امان میں ہوں گے۔ مختلف روایات کے مطابق اہل ایمان (مومنین) کو اس دھوئیں سے زکام کی کیفیت سے زیادہ تکلیف نہ ہوگی۔ بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صور کی اس آواز سے حاملہ عورت کا بچہ گر جائے گا (پیدا ہو جائے گا) اور لوگ مدہوش ہو جائیں گے اور شیر خوار بچوں کو دودھ پلاتے والی عورتیں اپنے شیر خواروں سے بے خبر ہو جائیں گی جیسا کہ پروردگار عالم نے سورۂ مبارکہ حج کی ابتدائی آیات میں بیان فرمایا ہے' لہٰذا اہل ایمان جو ان تمام باتوں سے باخبر ہیں اور اعمال صالحہ سے آراستہ رہتے ہیں چونکہ انہیں یہ معلوم ہوگا کہ یہ قیامت کی پہلی علامت ہے' انہیں کوئی تکلیف یا پریشانی لاحق نہ ہوگی کیونکہ وہ اعمال صالحہ بجا لا چکے ہوں گے۔

تمام مخلوق موت کی نیند سو جائے گی اور صرف خدا باقی رہے گا

صور اسرافیل کی دوسری آواز یا پھونک تمام مخلوق کی موت کی پھونک سے تعبیر کی جاتی ہے اور اس صور سیپ (ھونک کی اس آواز سے) زمین و آسمان کے تمام لوگ موت کی آغوش میں چلے جائیں گے' یہاں تک کہ چہار مقرب فرشتے یعنی

حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام موت کی نیند سو جائیں گے۔ اس موقع پر رب ذوالجلال کی ندا آئے گی کہ آج کس کی بادشاہت ہے۔ پھر یہی ندا خود جواباً کہے گی:

لَیسَ المُلکُ الیَومَ لِلّٰہِ الوَاحِدِ القَھَّارِ.

''آج حکومت خاص خدا کی، جو اکیلا اور غالب ہے۔''

(سورۃ المومن آیت ۱۰ سے ماخوذ حصے کا ترجمہ۔)

حضرت سید الساجدین علیہ السلام کی ایک روایت کے مطابق **نفخۂ اماتہ** یعنی صور اسرافیل کی وہ آواز جس کے نتیجے میں تمام مخلوق مر جائے گی سے قیامت کی آمد تک چار سو سال کی مدت کا وقفہ آئے گا اور اس وقفہ کے دوران یعنی مسلسل ۴۰۰ سال تک کسی ذی روح کا وجود نہیں ہوگا۔

موت جسم کو ہے نہ کہ روح کو

جیسا کہ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ جو موت صور اسرافیل کی دہشت ناک آواز سے واقع ہوگی اس کا تعلق اجسام سے ہے نہ کہ ارواح سے چنانچہ ارواح، باقی رہیں گی۔ لہٰذا حضرت سید الساجدین علیہ السلام کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر جسم اپنی روح سے چار سو سال تک جدا رہے گا اور جب قیامت برپا کرنے کا ارادہ مشیت الٰہی میں آئے گا تو صادق آل محمد علیہ السلام کی روایت کے مطابق چالیس روز (دن رات) تک بارش ہوگی۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ بارش ہمارے یہاں ہونے والی بارشوں کے مانند نہیں ہوگی۔ بہرحال معلوم نہیں کیسی ہوگی شاید ایسی ہو جیسے پرنالوں سے بارش کا پانی نکلتا ہے اور روایت میں بھی یہی بات ملتی ہے کہ کرۂ

ارض کے چپہ چپہ پر بارہ بارہ گز پانی ٹھہر جائے گا اور زمین کی تہوں میں کوئی ایسا ذرہ نہ ہوگا جو اس پانی سے تر نہ ہوا ہوگا۔

حضرت اسرافیلؑ زندہ کیے جائیں گے اور صور پھونکیں گے

پہلی مخلوق جو حکم الٰہی سے دوبارہ زندہ ہوگی وہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہوں گے۔ پھر انہیں حکم الٰہی ہوگا کہ صور پھونکیں' اس کے بعد حضرت اسرافیلؑ کی ندا آئے گی:

''اے خاک یکساں ہونے والی ہڈیاں'

اے گوشت کے ریزہ ریزہ ہونے والے ذرے'

اے بکھرے ہوئے بال'

انہیں حکم الٰہی ہوگا کہ صور پھونکیں۔ اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام گلی ہوئی ہڈیوں' ریزہ ریزہ ہونے والے گوشت کے ذروں اور بکھرے ہوئے بالوں کو مخاطب کریں گے اور ندا دیں گے کہ خدا حکم دے رہا ہے کہ قیامت کے لیے اکٹھے ہو جاؤ۔ جسموں کے بکھرے ہوئے ذرات جو ایک دوسرے میں مخلوط ہوں گے' ایک دوسرے سے جدا ہوں گے' اپنے اپنے اجسام سے مل جائیں گے۔ صادق آل محمد علیہ السلام فرماتے ہیں!

مومن کے جسم کے ذرات کافر کے جسم کے ذرات میں مٹی کے ذروں میں ملے ہوئے سونے کے ذرات کے مانند ہوں گے۔ مومن کے جسم کے ذرے کافر کے جسم کے ذروں سے اسی طرح نکھر جائیں گے جیسے بارش سے سونے کے ذروں سے مٹی دھل جاتی ہے' چنانچہ اجسام کے بکھرے ہوئے ذرے یکجا ہو جائیں گے اور

ہر جسم میں اس کی روح پھونکی جائے گی اور سب حکم الٰہی پر لبیک کہتے ہوئے دوبارہ زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔

بزرگ ہستیاں قیامت کی برہنگی سے خائف ہیں

معالم الزلفی نامی کتاب میں منقول ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

روز قیامت عورتیں ''مستورات'' برہنہ حالت میں محشور ہوں گی۔ یہ سن کر فاطمۃ الزہراؑ گریہ فرمایا کرتی تھیں اور ہائے رسوائی کے الفاظ کو بار بار دہراتی تھیں کہ حضرت جبرئیل امینؑ حضور ختمی مرتبتؐ کی خدمت میں آسمان سے تشریف لائے اور عرض کی کہ:

خدا نے حضرت زہراؑ کو سلام کا پیغام بھیجا ہے اور فرمایا ہے ہم حضرت زہراؑ کو اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ آپ کو بروز قیامت بہشتی پوشاک کے جوڑے سے نوازیں گے نیز حضرت فاطمہ بنت اسد حضرت علی علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے جنہیں وقت وضع حمل کعبہ کے اندر داخل کیا گیا تھا اور تین دن تک خدا کی مہمانی کا شرف حاصل ہوا تھا اور جن کو رسول خداؐ اپنی ماں کا رتبہ دیتے تھے' قیامت کے دن کی برہنگی کی رسوائی سے حضور پاکؐ کی خدمت میں گریہ کیا اور آپ کی پناہ طلب کرتے ہوئے گزارش کی کہ میری تجہیز و تکفین کا انتظام کسی پوشاک کے کپڑے سے فرمائیں۔

ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ اپنے انتقال سے کچھ دیر قبل حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو (جن کی عمر مبارک اس وقت ۷ سال سال تھی) رسول خداؐ کی خدمت میں بھیجتے ہوئے کہا!

اپنے پدر بزرگوارؐ سے کہو کہ میری ماں کہہ رہی ہیں' میری آپ سے یہ التجا

ہے کہ اپنی پوشاک کے کپڑے سے میرا کفن تیار فرمائیں تاکہ میدان حشر میں برہنہ حالت داخل نہ ہوں۔

اسلام کی بزرگ ہستیوں کو اس قدر خوف قیامت کی رسوائیوں سے تھا، جس کی سختیوں اور تکالیف کے بارے میں قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

''جس دن بلانے والا ایک اجنبی اور ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔''

جس چیز کو انسان ناگوار اور اجنبی سمجھتا ہے تو فطری طور پر اس کے لیے خوف و پریشانی کا باعث بنتی ہے نیز قبر میں پہلی رات آنے والے دو فرشتوں کا نام منکر ونکیر ''نکیرین'' ہے۔ یہ دو فرشتے کفار و مشرکین کے لئے منکر ونکیر ثابت ہوں گے، نہ کہ مومنین کے لیے۔ لہٰذا مرحوم فیض اور دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ قبر میں پہلی رات فرشتوں کا آنا اور ان کی ہیئت میت مردہ کے عمل پر منحصر ہے، چنانچہ اگر فرد صالح ہوگا تو مبشر و بشیر کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ دوسری صورت میں میت کی قبر میں منکر ونکیر کی ہیئت میں آئیں گے بہ الفاظ دیگر وہی دو فرشتے مومن کے لیے قبر میں خوبصورت شکل میں خوشخبری کے ساتھ داخل ہوں گے اور فاسق و فاجر اور کافر کی قبر میں عذاب الٰہی کے پروانہ کے ہمراہ خوفناک شکل میں ظاہر ہوں گے۔

درحقیقت فرشتے دونوں حالتوں میں مومن کی قبر اور کافر کی قبر میں ایک ہی ہیں، جیسا کہ حضرت عزرائیل ''ملک الموت'' روح قبض کرتے وقت نیک اور صالح افراد کے سامنے خوبرو مخلوق کی صورت میں آتے ہیں اور فاسق و فاجر کافروں کی روح قبض کرنے کے وقت ان کے سامنے انتہائی خوفناک اور ہیبت ناک شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

دراصل یہاں پر آیت میں لفظ ''نکر'' یعنی اجنبی اور ناگوار کی وضاحت کے

ضمن میں ان مثالوں کو پیش کیا گیا ہے اس طرح آیت مذکورہ میں دراصل کفار اور گناہ گاروں کے لیے ہے یعنی بلانے والا انہیں ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔ یہ چیز نیک لوگوں کے لیے ناگوار نہیں ہوگی۔

بکھری ہوئی ٹڈیاں

"خُشَّعاً اَبْصَارُهُمْ . یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ کَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ. (القمر . ۷)

"تو قیامت سے آنکھیں نیچے کئے ہوئے قبروں سے نکل پڑیں گے گویا وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہیں۔"

"ایسی حالت میں کہ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی یا خاشع ہوں گی۔"

خشوع و خضوع کا تعلق دل سے ہے اور اس کے اثرات اعضاء و جوارح پر مرتب ہوتے ہیں اور اس کا سب سے زیادہ اثر آنکھوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھیں دل سے مربوط ہیں۔ خوشی و غمی، شرم و حیا یہ سب صفات آنکھوں کے ذریعے محسوس کی جا سکتی ہیں، اس لحاظ سے پروردگار عالم خشوع و خضوع کو آنکھوں سے منسوب فرماتا ہے گو کہ خشوع کا تعلق دل سے ہے لیکن ذلت و رسوائی کی علامات ان کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی ہوں گی اسی لیے خدا ارشاد فرماتا ہے:

"ان کی آنکھیں خاشع ہوں گی، شرم اور رسوائی کی وجہ سے وہ اپنی آنکھیں نیچے کئے ہوئے قبروں سے نکل پڑیں گے۔"

یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ.

"قبروں سے نکل پڑیں گے۔"

''اجداث'' لفظ جدث کی جمع کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں ''قبر''

گویا وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہیں۔ ٹڈی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی حرکت و انتقال میں بدنظمی جیسی حالت پائی جاتی ہے۔ آپ نے اس امر کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب ٹڈیاں حرکت و انتقال کرتی ہیں تو در و دیوار یا دوسری چیزوں سے ٹکراتی ہیں' اسی وجہ سے ٹڈی دل کی بے شمار ٹڈیاں گر جاتی ہیں۔ پروردگار عالم نے لوگوں کے قبروں سے نکلنے کو بکھری ہوئی ٹڈیوں سے تشبیہ دی ہے چونکہ قیامت میں قبروں سے نکلنے والے لوگ حیران و پریشان ہوں گے' جن چیزوں کو انہوں نے کبھی نہ دیکھا ہوگا' ان کا مشاہدہ کریں گے اور ایسے مقام کی جانب جانا ہوگا جہاں پہلے کبھی نہ گئے تھے۔ ازل سے ابد تک آنے والے لوگ جو مر چکے ہوں گے۔ تمام کے تمام قبروں سے نکل پڑیں گے اور ان کا ایک ہی مقام پر اجتماع ہوگا۔

وہ لوگ جو مضطرب و پریشان نہ ہونگے

لوگوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہوگا جسے کوئی حیرانی یا اضطراب یا پریشانی لاحق نہ ہوگی۔ وہ مومن اور عمل صالح انجام دینے والے لوگ ہوں گے اور خدا نے ان کے دلوں کو قرار و سکون سے سرشار کیا ہوگا اور اسی حالت میں انہوں نے دنیا سے انتقال کیا ہوگا۔

هُوَالَّذِیْ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ.

''وہی (خدا) تو ہے جس نے مومنین کے دلوں میں تسلی نازل فرمائی ہے۔''

چنانچہ جو لوگ اپنے دل میں سکون و طمانیت کی حالت میں دنیا سے انتقال

کرتے ہیں انہیں انتقال کے دن سے روز قیامت تک کوئی پریشانی لاحق نہ ہوگی۔ اگر کوئی شخص اس دنیا میں عقیدہ وعمل کے لحاظ سے شک وتردید کی حالت کا شکار ہے تو یقیناً آخرت میں بھی مضطرب و پریشان ہوگا۔

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى.

''اور جو شخص اس دنیا میں جان بوجھ کر اندھا بنا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا۔'' (بنی اسرائیل ۷۲)

لہٰذا یہاں اور وہاں کا مسئلہ درپیش نہیں بلکہ اگر کسی شخص کا عقیدہ یہاں پر مضبوط نہیں اور مضطرب ہے تو وہ شخص عقیدے کی اس اضطرابی حالت و کیفیت میں میدان حشر میں داخل ہوگا۔

كَمَا تَعِيْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ تُبْعَثُوْنَ.

''اور جس حالت میں زندگی گزارتے ہو اسی حالت میں موت آئے گی اور اسی حالت میں دوبارہ قبروں سے زندہ کیا جائے گا۔''

ٹڈی سے تشبیہ دینے کی وجوہات

قیامت کے روز قبروں سے اٹھنے والے انسانوں کو جو ٹڈی سے تشبیہ دینے کی ایک وجہ تو پریشانی و حیرانی بیان کی گئی ہے اور دوسری وجہ جیسا کہ پہلے بتا چکے ہیں ان کی تعداد کی کثرت ہے کیونکہ کائنات میں پیدا ہونے والے پہلے انسان سے لے کر روز قیامت تک آنے والے انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور ایک ہی مقام پر جمع ہوں گے۔ یہ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ قیامت کے دن ایک ہی مقام پر جمع کئے جانے والے انسانوں کی تعداد کیا ہوگی۔

ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ٹڈی اندھیری رات میں حرکت و انتقال نہیں کرتی اور جب تک سورج نہ نکلے اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا کہ ریگستان میں کتنی ٹڈیاں سوئی ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہوتی ہیں اور کسی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ اس طرح اس زمین میں انسانوں کے کتنے اجساد دفن ہیں یا قبروں میں کتنے مردے سو رہے ہیں یہ کسی کو بھی خبر نہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہر شخص اپنے زمانے کا ہی حساب کتاب رکھ سکتا ہے حالانکہ کائنات کی تخلیق انتہائی طویل عرصہ قبل ہوئی تھی' اس طرح دنیا کی عمر بھی انتہائی طویل ہے۔ چین کی تاریخ اسی (۸۰) ہزار سال پرانی تاریخ ہے نیز بعض یورپین لوگوں کے اندازے ہیں کہ انسان کی تخلیق کو ایک لاکھ سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اس امر کا صرف خدا کو علم ہے کہ موجودہ زمانے کے بعد کتنے زمانے آئیں گے اور کتنے انسان پیدا ہوں گے اور دنیا سے رخصت ہوں گے۔ فی الحال گزشتہ زمانوں میں اور موجودہ زمانے کے مرنے والے افراد اپنی قبروں میں آرام کر رہے ہیں اور قیامت کے دن تک جو بھی افراد دفن ہوں گے سب کے سب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ تو اس وقت معلوم ہوگا کہ کتنے انسان زمین کی تہوں میں ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا.

''اور زمین اپنے اندر کے بوجھ نکال ڈالے گی''

ٹڈیوں سے تشبیہ کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ٹڈی میں مختلف جانوروں کی علامات پائی جاتی ہیں' اس کا سر گھوڑے کے سر سے مشابہت رکھتا ہے' اس کی آنکھیں ہاتھی کی آنکھوں جیسی ہوتی ہیں اور سر کے دو بال ''سینگ'' گوزن کے سینگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اور اس کی گردن ٹڈی کی گردن کی مانند اور اس کا

سینہ شیر کے سینے جیسا اور اس کی دم سانپ کی دم کی طرح اور اس کے پر مردار خور ''کرگس'' کے پروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ تمام جانور جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اپنے اپنے گروہ کے سلطان یا بادشاہ شمار ہوتے ہیں اور ٹڈی میں ان تمام جانوروں کے نمونے یا مثال موجود ہے لیکن حقیقی مفہوم میں اس میں ان تمام جانوروں کی کوئی صفت موجود نہیں ہے' صرف یہ کمال ہے کہ اس کے منہ کا لعاب ہرے بھرے کھیتوں کی فصلوں کے لیے زہر قاتل ہے۔ ٹڈی کے دو پاؤں بظاہر آراستہ ہیں اور کھیرے سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن روز آخرت جہاں ''یَوْمَ تُبْلَی السَّرَائِر'' تمام راز اور پوشیدہ باتیں آشکار کی جائیں گی۔ لہٰذا جو آپ دیکھ رہے ہیں بیشتر آدمی ہیں لیکن ان میں بہت کم لوگ انسان ہیں۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو میسر نہیں انساں ہونا

یہ آدمی پھیلی ہوئی ٹڈیوں کے مانند کسی قابل تعریف صفت کے حامل نہیں لیکن جو صاحبان ایمان ہیں وہ ٹڈیوں کے مانند حیران اور مضطرب نہیں ہیں کیونکہ ان کے ظاہر و باطن ایک ہیں۔ عظیم خوف و دہشت انہیں لاحق نہیں ہوگی۔

لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَر.

''اور ان کو قیامت کا بڑے سے بڑا خوف بھی دہشت میں نہ لائے گا۔''

انہیں اس لیے کوئی دہشت و خوف نہیں کیونکہ صاحب کمال مومن ہیں اور اسی کمال وعظمت کے باعث انہیں قیامت سے اس کا خوف و دہشت نہیں۔ یہ کمال وعظمت وہ ہے کہ ہر مقام پر ان کا ساتھی ہے اور ان سے واپس نہیں لیا جائے گا۔

بے شک عظمت و کمال صرف صاحب ایمان افراد میں ہی پایا جاتا ہے۔ دیگر تمام کمالات جو دنیوی ہیں ان کی حیثیت صرف لب گور تک قائم رہتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر یا پروفیسر یا گریجویٹ کو تو صرف ایک کاغذ کی ڈگری ملتی ہے، جس کے بدلے وہ کاغذ کے بنے ہوئے نوٹ حاصل کر سکتا ہے۔ خوش نویس اور انتہائی درجہ کا خوشنویس ہو آخر میں اس کے ہاتھوں میں رعشہ ہوتا ہے تو وہ اس کمال سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ سب کمالات مستعار ہیں ہمیں اپنی جان اس پر نچھاور کرنی چاہیے جو حقیقی کمالات کا طالب ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حقیقی کمالات کے اعلیٰ مدارج کو طے کرتا چلا جائے یعنی خدا کے بارے میں اس کے یقین محکم اور عقیدہ میں مزید پختگی پیدا ہو جائے۔

مُّهطِعِينَ اِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ

(القمر ۸)

"بلانے والے کی طرف گردنیں بڑھائے دوڑتے جاتے ہوں گے کفار کہیں گے یہ تو بڑا سخت دن ہے۔"

یہ بات ان کی مرضی پر منحصر نہیں کہ وہ چاہیں تو جائیں اور چاہیں تو نہ جائیں۔ سب کو ہر صورت میں بلانے والے کی جانب گردنیں بڑھائے دوڑنا ہوگا۔

"مہطعین" کے معنی ہیں ایک اہم معاملے کی جانب دیکھنے کے لیے گردنیں بڑھانے کے جبکہ آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی ہوں۔ یہ قیامت کے ایک موقف "رکنے" کا مقام ہے جو مقام حیرت ہے۔ اس مقام پر گردنیں بڑھی ہوئی اور آنکھیں آواز کے آنے کی سمت متوجہ ہوں گی۔ اس مقام میں کتنی دیر رکنا ہوگا، اس کا اندازہ یہ مختلف اشخاص کے لحاظ سے الگ الگ ہے جو روایات سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض افراد کو مقام "مقام حیرت" پر چالیس سال تک رکنا ہوگا جبکہ مقام

حساب پر رکنے کا وقت ایک جداگانہ بحث ہے۔

یا تو یہاں پر سمجھ جائے یا وہاں پر اسے سمجھا دیا جائے گا

جو شخص عظمت الٰہی کو یہاں پر ''اس دنیا میں نہیں سمجھ پاتا اور الٰہی عظمت و ہیبت اسے خائف نہیں کرتی تو اسے قیامت کے دن خدا کے نام اور صفات کی عظمت کو جاننا ہوگا اور سمجھنا ہوگا کہ خدا کی ذات عظیم ''باعظمت''، جلیل، عظیم القدر، عظیم المنزلت اور عزیز صاحب عزت و بزرگی ہے۔ بعض افراد اس حد تک بے وقوف اور احمق ہوتے ہیں کہ وہ ایک روپیہ کو خدا سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ جھوٹی قسم کھاتے ہیں تاکہ کسی لین دین میں انہیں ایک روپیہ زیادہ حاصل ہو جائے۔ قیامت کے دن نادان اور بے وقوف شخص کو یہ جاننا پڑے گا کہ خدا جو تمہارے تصور کے مطابق عظیم ہے اس سے کہیں زیادہ عظیم تر ہے۔ اب کیونکہ اسے یہاں پر اس کی عظمت کا ادراک حاصل نہ ہو سکا تو اسے قیامت کے دن اس کی عظمت کیا ہوگی؟ یہ بات سمجھا دی جائے گی۔

''کافر لوگ کہیں گے یہ تو بہت سخت دن ہے''

ایک روایت میں منقول ہے کہ کافر لوگ کہیں گے خدایا ہمیں جلدی اس دن ''قیامت کا دن'' سے نجات عطا فرما اور ہمیں جہنم روانہ فرما دے۔ آپ سمجھ رہے ہیں اس بات کو کہ کافر کو اتنی زیادہ تکلیف ہوگی کہ وہ جہنم میں جانے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔ جن لوگوں کا جہنم ٹھکانہ ہے بے شک روز قیامت ان کے لیے تکلیف دہ اور سخت دن ہوگا قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذَ ا الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ کَاظِمِیْنَ (المومن--۱۸)

''جب لوگوں کے کلیجے مارے ڈر کے منہ کو آ جائیں گے۔''

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا

(طه. ۱۰۸)

''اور آوازیں اس دن خدا کے سامنے اس طرح گھگیا ''دب'' جائیں گی کہ تو گھنگھناہٹ کے سوا کچھ نہ سنے گا''

یہ ہیں دہشت طاری کرنے والی باتیں اور گزشتہ آیات میں جو لفظ نباء استعمال کیا گیا تھا وہ یہی باتیں ہیں، یہی خوفناک امور ہیں، کیا کوئی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے۔ قرآن مجید کے حقائق اس کے دل و دماغ پر اثر ڈال سکتے ہیں تاکہ ایسے ہولناک اور سخت تکلیف والے دن کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر سکے اور اپنی اخروی زندگی کے لیے زادِ راہ آمادہ کرنے کی فکر کرے؟ کیا یہ باتیں ہمارے بارے میں نہیں ہیں۔ کیا کوئی اس سند کا حامل ہے کہ اس دن کی ہولناک، خوفناک اور تکلیف دہ گھڑیوں سے محفوظ ہے۔ اس کا دل جس قدر صاف ہوگا تو یہ آیات اس کے دل پر زیادہ اثر ڈالیں گی۔

مسلمان کو خوف سے رات بھر نیند نہ آئی

منہج اور دیگر کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق میں مسلمانوں نے رسول خدا ؐ کے ہمرکاب ہو کر جہاد کیا۔ رات کے آغاز میں سورۂ حج کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔

''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو کیونکہ قیامت کا زلزلہ کوئی معمولی نہیں، ایک بڑی سخت چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھ لوگے تو ہر دودھ پلانے والی ڈر کے

مارے اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ساری حاملہ عورتیں اپنے حمل دہشت سے گرا دیں گی اور مرد گھبراہٹ میں مدہوش ہوں گے حالانکہ وہ مدہوش نہ ہوں گے بلکہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے کہ لوگ بدحواس ہو رہے ہوں گے۔ آگے چل کر ان کتب تفاسیر میں بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس رات خوف کی وجہ سے نیند نہ آئی۔

یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ شیطان نے ہمارے کانوں میں کیا پھونک دیا ہے۔ کیا یہ آیات ہماری بیداری اور تنبیہ کے لیے کافی نہیں ہیں۔

پاکیزہ ہستیاں خائف ہو کر گریہ وزاری کرتی ہیں

اس آیۂ شریفہ:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوعِدُهُمُ اَجْمَعِيْنَ لِمَا سَبعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ جُزْءٍ مَقْسُوْمٌ.

نزول کے بعد روایات کے مطابق حضور ختمی مرتبتؐ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام نے زار و قطار گریہ وزاری فرمائی۔

اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ جب اتنی عظیم ہستیاں ایسی آیات سن کر گریہ وزاری میں مصروف ہو جاتی ہیں تو ہم نے کون سا کمال انجام دیا ہے کہ ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

''کیا وہ وقت نہیں آ گیا کہ ہمارا دل خدا اور خدا کی یاد میں جھک جائے۔''

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمِ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ.

سابقہ اقوام کی روداد

پروردگارِ عالم نے اس سورۂ مبارکہ کی ابتداء میں معجزۂ شق القمر یعنی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے اور مشرکین کے معاندانہ رویہ کی جانب اشارہ فرماتے ہوئے اس بات کو واضح طور پر آشکار کیا ہے کہ یہ لوگ (مشرکین) ایمان لانے کے بجائے رسول خدا حضرت محمد مصطفیؐ کو جادوگر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسولؐ نے ہماری آنکھوں کو مسحور کیا ہے۔ چنانچہ خداوند متعال اپنے حبیبؐ کے دل کی تسکین اور اطمینان کے لیے سابقہ اقوام کی داستان اور ان پر آنے والے مصائب و آلام کو بیان فرماتا ہے کہ اگر مشرکین نے آپ کو جھٹلایا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آپؐ سے پہلے آنے والے مرسلین کو بھی اسی طرح جھٹلایا جاتا رہا ہے' نیز ان سے بھی سحر اور جادو کو منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بات بھی یاد دلانا

ضروری ہے کہ سابقہ اقوام کی داستانوں اور قصہ کہانیوں اور ان سے مربوط واقعات بیان کرنے کا مقصد مشرکین کو ڈرانا دھمکانا ہے تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ سابقہ اقوام کا انبیاء کو جھٹلانے کے نتیجے میں کن کن مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس طرح ممکن ہے مشرکین بھی خدا کے عذاب سے خائف ہو جائیں۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ.

پس اگر یہ (مشرکین) تمہیں جھٹلاتے ہیں تو آپؐ سے قبل آنے والے رسولوں کو بھی اسی طرح جھٹلایا گیا تھا۔"

قوم نوحؑ کی روداد

"كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ. (القمر - ۹)

"اس سے پہلے نوح کی قوم نے بھی جھٹلایا تھا، تو انہوں نے ہمارے خاص بندے (حضرت نوحؑ) کو جھٹلایا اور کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے اور اسے اذیت دی گئی۔"

اس آیۂ مبارکہ میں لفظ "عبدنا" ایک اہم نکتہ ہے دراصل خدا چاہتا ہے کہ اپنے بندے حضرت نوح علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کو آشکار کرے۔ نوح علیہ السلام کا لقب شیخ الانبیاء ہے۔ آپؑ پہلے اولو العزم پیغمبر اور صاحب شریعت رسولؑ ہیں۔ قرآن مجید میں بھی آپ پر درود و سلام بھیجا گیا۔

سَلَامٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعَالَمِيْنَ.

چنانچہ جو آیت موضوع بحث ہے، اس میں بھی خدا کی جانب سے حضرت

نوح علیہ السلام کی غیر معمولی طور پر تعظیم کی جا رہی ہے۔ خدا انہیں اپنا خاص بندہ قرار دے رہا ہے۔ یہ شرافت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے نوح کو عبدنا سے ممتاز کیا جا رہا ہے۔ نہ کہ عبدی سے، کیونکہ عظمت کے بیان کے لئے صیغۂ جمع سے استفادہ کیا جاتا ہے یعنی ہمارا بندہ کہ ہم رب العالمین ہیں۔ یوں مضاف مضاف الیہ سے شرافت کے بلند مقام کو کسب کرتا ہے۔

بندگی خدا شرافت وعظمت انسانی

خدا کی بندگی انسانی شرافت وعظمت کا اعلیٰ ترین مقام ہے، یہ مقام اس حد تک بلند مرتبہ اور جلیل القدر ہے کہ نبوت اور رسالت سے بھی بالاتر شمار ہوتا ہے اور نماز کے تشہد میں ہم گواہی دیتے ہیں کہ حضرت محمدؐ خدا کے بندے ہیں اور بعد میں آپؐ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں:

وَاَشْهَدُاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ.

''اور اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں۔''

دلجوئی دل کو مطمئن کرتی ہے

پروردگار عالم اجمالی طور پر اپنے حبیب حضرت محمدؐ کے اطمینان قلب کی خاطر حضرت نوح علیہ السلام کی روداد اور انہیں پہنچنے والی اذیتوں کو بیان فرماتا ہے۔

کیونکہ اگر کسی شخص کو کسی معاملہ کی وجہ سے کوئی تکلیف یا مصیبت لاحق ہوتی ہے تو اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے کہ ہر معاملہ دیگر افراد کو بھی درپیش رہا جنہوں نے مصائب و آلام کا سامنا کیا تو اس طرح تکلیف میں مبتلا شخص کو ایک حد

تک تسلی ملتی ہے اور تکلیف کی شدت اس پر گراں نہیں گذرتی' لہٰذا مختلف روایات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص کسی بھی مصیبت میں مبتلا ہوا ہے اسے ان افراد کو سامنے رکھنا چاہیے جن کی مصیبت کی شدت اس کی مصیبت سے زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بیمار ان بیماروں کو اپنی خاطر میں لائے یا ان کا مشاہدہ کرے جن کی بیماری اس کی بیماری سے بدرجہ ھا زیادہ ہے تو اس کے نتیجہ میں اسے قدرے سکون میسر ہوگا۔

فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ (القمر : ۹)

"انہوں نے ہمارے خاص بندے (نوحؑ) کو جھٹلایا اور کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے۔"

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ رب العزت نے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنی ذات الوہیت سے 'منسوب فرمایا' ارشاد ہوتا ہے: "عبدنا" ہمارا بندہ' یہ "نا" کا اضافہ حضرت نوح علیہ السلام کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے' لیکن اس ذلیل قوم نے ہمارے بندے کی نسبت گستاخی کی اور انہیں جھٹلایا اور انہیں کہنے لگے دیوانہ ہے۔

اگر کوئی شخص جاہل لوگوں کے طور طریقے کے برخلاف چلتا ہے تو اسے دیوانہ کہا جاتا ہے۔ آج بھی یہ انداز اپنایا جاتا ہے کہ صاحبان ایمان کو سادہ لوح' خبطی اور نادان کہا جاتا ہے چونکہ یہ صاحبان ایمان اور صالح انسان' ذلیل و رذیل نہیں ہیں کہ اپنی بیویوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انہیں رات کی رنگین محفلوں میں دوسرے آدمیوں اور نامحرم افراد کے حوالے کرتے ہیں تا کہ ان کے ساتھ رقص کریں۔

صادق آلِ محمدؑ فرماتے ہیں:

"حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو نماز پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے اور انہیں برائیوں اور منکرات کے ارتکاب سے منع فرمایا کرتے تھے اسی لیے وہ نوح علیہ السلام کو دیوانہ اور باؤلا کہتے تھے۔"

"وَازْدَجِرْ" حضرت نوح علیہ السلام کو بہت اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں۔ نوح علیہ السلام نے تمام انبیاء اولین و آخرین کی نسبت سب سے طویل عمر پائی ہے۔ جب آپ مبعوث بہ رسالت ہوئے تو مختلف روایات کے مطابق آپ کی عمر شریف ۱۲۶ سال، ۱۵۰ سال، ۲۵۰ سال، ۳۰۰ سال، ۵۰۰ سال بھی بتائی گئی ہے جبکہ طوفان نوح سے قبل آپ کی نبوت کی مدت قرآنی آیات کے مطابق ۹۵۰ سال تھی۔

فَلَبِثَ فِيهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِينَ عَامًا.

"تو وہ ان میں پچاس کم ہزار برس رہے۔" (العنکبوت-۱۴)

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو بددعا دینے اور بددعا کے نتیجہ میں اس قوم کی ہلاکت کے بعد بھی ۹۰۰ برس کی عمر تک زندہ رہے' مختلف روایات کے مطابق زندگی کی مدت ۵۰ سال سے کم نہیں بتائی جاتی۔ بہر طور موت کے وقت یقیناً آپ کی عمر شریف ۱۵۰۰ سال ہو گی' نیز دو ہزار سال بھی بتائی جاتی ہے۔

مختصراً آپ کو تقریباً ایک ہزار سال تک اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائی گئیں۔

حضرت نوحؑ کا قوم کی رہنمائی کے لیے انتخاب

بحار الانوار کی ایک روایت کے مطابق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''حضرت نوح علیہ السلام دریائے فرات کے قریب، شہر کوفہ کے مغرب میں واقع ایک گاؤں میں اقامت پذیر تھے اور موجودہ مسجد کوفہ آپ کی رہائش گاہ تھی۔ آج بھی مسجد کوفہ میں حضرت نوح کے نام سے ایک جگہ موجود ہے۔ آپ پیشے کے لحاظ سے بڑھئی تھے اور معاشرتی زندگی سے مسلسل دور رہے، آپ کبھی جنگلوں، بیابانوں میں اور کبھی پہاڑوں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک روز جبرئیل امین علیہ السلام آپ کو نظر آئے، جبرئیلؑ نے حضرت نوح سے فرمایا:

''آپ لوگوں سے کیونکر کنارہ کش رہتے ہیں؟''

حضرت نوحؑ نے کہا:

''کیونکہ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔''

جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا:

''انہیں کیوں خدا یگانہ کی طرف متوجہ نہیں فرماتے؟''

آپ نے جواب دیا:

''مجھے خوف ہے کہ کہیں مجھے مار نہ ڈالیں۔''

جبرئیل علیہ السلام نے اچانک ایک شدید آواز بلند کی جس کے جواب میں

ہر گوشہ و کنار سے ملائکہ کی صدائے لبیک لبیک آنے لگی۔ دراصل اسی طرح حضرت جبرئیلؑ نے حضرت نوحؑ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ یکہ وتنہا نہیں ہیں۔

حضرت نوحؑ پر دہشت وخوف طاری ہو گیا اور جبرئیل امینؑ نے فرمایا:

میں ہوں جبرئیلؑ پروردگار عالم کا امین اور آپ کے لیے چند خصلتیں لے کر آیا ہوں۔

خلعت صبر' خلعت یقین اور خلعت نصرت......

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام اس واقعہ کے بعد تمام تر قوت قلبی کے ساتھ بستی کی جانب روانہ ہوئے۔ اتفاق سے اس روز کسی عید کا تہوار منایا جا رہا تھا اور بستی کے تمام لوگ بیابان میں جمع تھے۔ وہ اپنے بتوں کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے' حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کے اجتماع کے قریب آئے تو سریانی زبان میں بلند آواز کے ساتھ کہا:

''لاالہ الا اللہ' کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔'' جس کے نتیجے میں تمام بت اوندھے منہ زمین پر گر پڑے اور آگ کے شعلے سرد ہو گئے۔

قوم کے سردار اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو اتنا زدوکوب کیا کہ آپ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اس قوم کے لوگوں نے بعد ازاں آپؑ کو ایک پارچہ میں لپیٹ کر آپؑ کے گھر میں پھینک دیا۔

زوجہ نوحؑ

حضرت نوحؑ کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کا نام ''عمورہ'' تھا جو پہلے روز ہی نوح علیہ السلام پر ایمان لے آئی تھیں۔ جیسا کہ ام المومنین حضرت خدیجہ سلام اللہ

علیہا ختمی مرتبت ؐ پر ایمان لے آئی تھیں۔

چنانچہ جب عمورہ کے باپ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنی بیٹی کو ڈرایا دھمکایا۔ آخر کار اس خاتون کو قید کر دیا گیا تاکہ وہ بھوک و پیاس کے سبب ہلاک ہو جائے۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد جب قید خانے کا دروازہ کھولا گیا' تاکہ اس خاتون کی میت کو اٹھایا جائے' تو انہوں نے خاتون کو زندہ جاوید پایا۔ اس موقع پر سب حاضرین نے پوچھا کہ تمہیں کس نے موت سے بچایا؟ تو عمورہ نے جواب دیا کہ نوح علیہ السلام کے خدا نے میری حفاظت کی ہے۔

حضرت نوح ؑ کی دوسری زوجہ ایک کافرہ عورت تھی جو آخر میں مشرکین کے ساتھ غرق ہو گئی تھی اور سورۂ تحریم کے آخر میں نوح علیہ السلام کی جس زوجہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دراصل وہ آپ ؑ کی یہی کافر زوجہ تھی۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا امْرَاَتَ نُوْحٍ. (التحریم ۱۰)

خدا نے کافروں (کی عبرت) کے واسطے نوح کی بیوی (واعلہ) کی مثال بیان کی ہے۔

اذیتوں اور تکالیف میں بے پناہ اضافہ

نو سو پچاس سال کی پوری مدت میں جس کے دوران میں حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو تبلیغ دین کرتے رہے صرف اسی (۸۰) افراد آپ پر ایمان لائے اور آپ کی رسالت کی تصدیق کی۔ اس طویل مدت میں بعض اوقات نوح علیہ السلام کو اس حد تک اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں کہ آپ کے اعضاء و جوارح سے خون بہنے لگتا تھا اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے آپ پر غشی طاری ہو جاتی تھی لیکن

پروردگار عالم آپ کو دوبارہ شفا یاب فرماتا اور آپ دوبارہ از سر نو تبلیغ کا آغاز فرماتے جبکہ کفار نئی اذیتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔

اس قوم کے بدبخت افراد مرنے سے قبل اپنے بیٹوں کو خصوصاً تلقین کرتے تھے کہ اس شخص پر کبھی ایمان نہ لانا۔ اس طرح یہ طریقہ نسل درنسل جاری رہا اور کئی صدیاں گذر گئیں۔

حضرت نوح علیہ السلام ۹۰۰ سال تک اپنی قوم کی ایذا رسانیوں، سختیوں، گستاخیوں اور دشنام طرازیوں کو صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات کافر آپ کی پوشاک کو آپ کی گردن پر اس شدت کے ساتھ لپیٹتے تھے کہ انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ اب آپ کی کوئی سانس باقی نہیں رہی۔ بہر حال ایک وقت آیا کہ آپ ان کی مسلسل اذیتوں سے بے بس ہو گئے اور خدا کے حضور نالہ وزاری کرتے ہوئے اپنی قوم کے خلاف پروردگار عالم سے شکوہ کیا اور اس نے مدد طلب فرمائی۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ.

"تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (بار الہا) میں ان کے مقابلے میں کمزور ہوں، اب تو ہی ان سے بدلہ لے۔"

نیز آپ نے اپنی قوم کے لیے بددعا فرمائی:

رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا.

(نوح ۲۶-۲۷)

"پروردگار! ان کافروں میں سے روئے زمین پر کسی کو بسا ہوا

نہ رہنے دے کیونکہ اگر تو ان کو چھوڑ دے گا تو یہ (پھر) تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی اولاد بھی گنہگار اور کافر ہوگی۔"

حضرت جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور فرمایا:

"یہ پوری کی پوری قوم ہلاک کر دی جائے گی۔ کشتی تیار کریں اور جب تک زمین سے پانی ابلتا رہے اور آسمان سے مینہ برستا رہے کشتی ہی پر سوار رہنا آپ اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں نجات پائیں گے۔"

عورتوں کو حمل ٹھہرنا بند ہو گئے

صادق آل محمد علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"پروردگار عالم نے اس دوران میں عورتوں کے رحم میں چالیس سال تک بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ختم کر دی۔ یعنی تمام عورتوں کے رحموں کو عقیم اور بانجھ بنادیا تاکہ طوفان کی آمد کے وقت کسی نابالغ اور شیر خوار بچے کا وجود نہ ہو اور چالیس سال کے بعد تمام لوگ کم از کم (چالیس سالہ) مکمل عقل وشعور کے حامل ہوں نیز حجت الٰہی پوری ہو چکی ہو۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اجمالی طور پر فرمایا:

"کشتی کی تیاری کے لیے کھجور کی گھٹلیاں کاشت کرو تاکہ کھجور کے درخت کے تختوں سے کشتی تیار کی جاسکے۔"

حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی

یہ کشتی کیونکر اور کس طرح تیار کی گئی:

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کشتی دو سال میں تیار ہوئی' کیونکہ یہ بہت بڑی کشتی تھی۔ اس میں تین منزلیں تھیں نیچے کی منزل وحشی جانوروں اور حشرات الارض کے لیے مخصوص تھی اور درمیانی منزل درندوں کے لیے بنائی گئی۔جبکہ اوپر کی منزل حضرت نوح علیہ السلام اور مومنین کے لیے مخصوص تھی۔

یہ کشتی مکمل طور پر بند تھی کیونکہ پانی نہ صرف زمین کے چشموں سے ابل رہا تھا بلکہ آسمان بھی موسلا دھار برس رہا تھا۔

کشتی کی لمبائی' چوڑائی اور بلندی کے سلسلے میں مختلف روایات میں منقول ہے:

''لمبائی اور چوڑائی اسی' اسی (۸۰) گز تھی اور اس کا ارتفاع ''یعنی اس کی بلندی'' پچاس (۵۰) گز تھی بعض روایات کے مطابق اس کی بلندی ۱۲۰، ۳۲۰ اور ۸۲۰ گز بتائی جاتی ہے۔

حضرت نوحؑ کا پوتا کشتی کے حالات بیان کرتا ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ خواہش کی کہ ہم طوفان نوح علیہ السلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جو افراد اس دور میں زندہ تھے ان میں سے کسی کو زندہ ہونے کا حکم دیں تاکہ ہم اس کی گفتگو سے طوفان نوح کے حالات سے باخبر ہو جائیں۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''کعب بن حام بن نوحؑ'' کی قبر پر تشریف

لائے اور فرمایا:

''خدا کے حکم سے زندہ ہو کر قبر سے باہر آؤ تو اچانک انتہائی خستہ حال بزرگ جس کے سر اور ریش کے بال سفید تھے قبر سے باہر آیا۔ آپؑ نے اس سے سوال کیا کہ تم کون ہو؟ جواب ملا کہ میں نوح علیہ السلام کا پوتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

''جب تمہارا انتقال ہوا تھا تم کیا اسی حال میں تھے؟''

اس نے کہا:

''نہیں، بلکہ ابھی ابھی جب آپ نے مجھے قبر سے باہر آنے کے لیے حکم دیا تو مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ قیامت آ گئی ہے اس لیے قیامت کی دہشت سے میری یہ حالت ہو گئی ہے جسے آپ مشاہدہ کر رہے ہیں۔''

پروردگار عالم نے بھی قرآن مجید میں ایسے دن ''قیامت'' کی دہشت کے بارے میں رشاد فرمایا ہے کہ:

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْماً يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا.

(المزمل-۱۷)

'تو اگر تم بھی نہ مانو گے تو اس دن کے عذاب سے کیونکر بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا۔''

نیز آپ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا:

کیا طوفان کے موقع پر تم موجود تھے؟ انہوں نے عرض کیا:

جی ہاں! فرمایا:

''کشتی کا رقبہ کیا تھا؟ نیز اس کے حالات بیان کرو؟ انہوں نے بتایا کہ کشتی کی لمبائی ۱۲۰۰ گز اور چوڑائی ۸۲۰ گز اور بلندی ۸۰ گز تھی' یہ تین منزلوں پر مشتمل تھی جو درندوں' جانوروں' پرندوں اور انسانوں کے لیے مخصوص کئے گئے تھے۔

کشتی کی تیاری میں حضرت جبرئیل کی رہنمائی

حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا:

''پروردگار! مجھے کشتی بنانی نہیں آتی۔ خدا نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ذمہ داری سونپی کہ نوح علیہ السلام کی کشتی کی تیاری میں رہنمائی کریں کیونکہ یہ ایک غیر معمولی اور اہم کشتی تھی۔ اس میں جانوروں اور انسانوں کے لیے خوراک' آرام ور کھانے پینے کی اشیاء اور رفع حاجت کے لیے علیحد علیحدہ حصے تیار کئے جانے تھے۔''

اس طرح حضرت نوح علیہ السلام اپنے دو بیٹوں ''سام'' اور'' حام'' کے ہمراہ جو اپنے بھائی کے برعکس صاحبان ایمان تھے' حضرت جبرئیل کی سرپرستی میں کشتی کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ نوح کے جس بیٹے نے اپنے باپ کی رسالت کو قبول نہیں کیا تھا اس کا نام ''کنعان'' تھا۔

دوسری طرف پروردگار عالم کی جانب سے نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اب لوگوں کو ایمان کی دعوت دینے کا کوئی فائدہ نہیں اور اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ مشرکین کو خدا کی بندگی کرنے کے لیے دعوت دی جائے۔

آلِ محمدؑ کی نجات کی کشتی کے راز

جب حضرت نوح علیہ السلام پہلا تختہ اُٹھانا چاہتے تھے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا:

حضرت محمدؐ کے نام سے، دوسرے تختے کو حضرت علیؑ کے نام سے، تیسرے کو حضرت فاطمہ زہراءؑ کے نام سے اور اس طرح ہر امام کے نام سے باری باری تختے اُٹھاتے گئے۔

جس وقت حضرت نوح علیہ السلام میخوں کو ٹھونکنا چاہتے تھے تو جب پہلی میخ ٹھونکی گئی تو ایک نور آشکار ہوا، نوح علیہ السلام نے سوال کیا:

"یہ کیسا نور ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ نور محمدیؐ ہے اور جب دوسری میخ ٹھونکی گئی تو اس میں سے بھی نور ظاہر ہوا، چنانچہ جبرئیل امین علیہ السلام نے فرمایا:

یہ علی علیہ السلام کا نور ہے اور حضرت جبرئیل بتاتے گئے یہاں تک کہ جب چودھواں نور ظاہر ہوا تو جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا:

کہ یہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا نور ہے۔"

مشرکین تمسخر کرتے رہے

جس وقت حضرت نوح علیہ السلام کشتی کی تیاری میں مصروف تھے تو مشرکین کا کوئی گروہ آپ کے قریب سے گذرتا تو وہ آپ کا تمسخر اڑاتے۔

وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ. (ھود ۳۸)

"اور جب کبھی ان کی قوم کے سر برآوردہ لوگ ان کے پاس

سے گذرتے تھے تو انہیں مذاق کرتے۔“

یہ لوگ کہتے تھے کہ نوح علیہ السلام نبوت سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور کشتی تیار کرنے لگے ہیں نیز مذاق کرتے ہوئے کہتے تھے کہ جس سال میں خشک سالی ہے آپ اس میں کشتی تیار کر رہے ہیں؟ کبھی کہتے تھے ”نعوذ باللہ“ یہ بوڑھا آدمی خبطی ہوگیا ہے اور اس نے احمقانہ کام کرنا شروع کر دیئے ہیں اور کبھی یہ کہتے تھے کہ نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہو کر آسمانوں پر جانا چاہتے ہیں۔

لیکن اس تمام مسخرہ پن کے باوجود حضرت نوح علیہ السلام کے پائے صبر و استقلال میں لغزش نہ آئی۔

زندگی میں ثابت قدم رہنا چاہیے

قرآن مجید میں مختلف احوال نقل ہوئے ہیں، سبق آموز اور دوسروں کے لیے درس عبرت ہیں۔ اے مومنین! اب جبکہ تم انبیاء کی پیروی کر رہے ہو اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو تمہیں ثابت قدم رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ تم لوگ مذاق اور تمسخر کی وجہ سے اپنے ارادوں سے برگشتہ ہو جاؤ اور میدان عمل سے فرار ہو جاؤ۔ آپ لوگ کسی سخت اور ناقابل برداشت بات کی وجہ سے اپنے پختہ ارادوں سے کسی قیمت پر برگشتہ نہ ہونا۔

مشرکین نہ صرف حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے تمسخر کا نشانہ بناتے بلکہ جب حضرت نوح علیہ السلام رات کو اپنے گھر تشریف لے جاتے تو وہ لوگ کشتی کے تیار حصوں کو توڑ پھوڑ کر برباد کر دیتے تھے اور آپ کی دن بھر کی محنت پر پانی پھیر دیتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا چنانچہ

آپ نے خدا کے حضور ان لوگوں کے اس عمل کی شکایت کی۔ خدا کا حکم ہوا کہ کشتی کی حفاظت کے لیے ایک کتا مقرر کریں۔ اس طرح نوح علیہ السلام نے ایک کتے کی انتہائی شفقت سے پرورش فرمائی اور کشتی کی حفاظت کا فریضہ اسے سونپ دیا چنانچہ اس کے بعد کوئی فرد کشتی کے قریب آنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

ناخلف بیٹا ہلاک ہو جاتا ہے

جب کشتی کی مکمل تیاری کے مراحل طے ہو گئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ مومنین جن کی تعداد آٹھ افراد سے زیادہ اور اسی (۸۰) افراد سے کم بیان کی گئی ہے کشتی میں سوار ہو جائیں۔

اس موقع پر نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے ''کنعان'' سے جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہوئی تھی فرمایا:

''ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کفار و مشرکین کے ساتھی نہ بنو۔'' (ورنہ غرق ہو جاؤ گے) اس نے جواب دیا: میں نہیں آؤں گا اور کسی اونچی پہاڑی کی چوٹی پر چلا جاؤں گا حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

''بیٹا! آج خدا کے عذاب سے کوئی نہیں بچ سکتا۔''

يٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلاَ تَكُنْ مَعَ الْكَافِرِيْنَ قَالَ سَاٰوِيْ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ قَالَ لاَ عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلاَّ مَنْ رَّحِمَ. (ھود-۴۲،۴۳)

اے میرے فرزند! آ ہماری کشتی میں سوار ہو جائیے اور کافروں کے ساتھ نہ رہ وہ بولا میں جلد ہی کسی پہاڑ کا سہارا پکڑ لیتا ہوں

جو مجھے پانی میں ڈوبنے سے بچا لے گا۔ نوح علیہ السلام نے
اس سے کہا آج خدا کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں مگر
جس پر خدا رحم فرمائے گا۔''

جب خدا کا عذاب آ جائے تو کوئی اس سے بچ نکل نہیں پاتا مگر رحمت الٰہی جس کے شامل حال ہو جائے۔ آخر کار پانی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گیا اور پانی نوحؑ کے نافرمان فرزند کے زانوؤں تک آ گیا۔ اس موقع پر حضرت نوحؑ پر شفقت پدری غالب آ گئی'' اور آپ نے پروردگار عالم سے اس فرزند کے لیے سفارش کرتے ہوئے عرض کیا:

رَبِّ اَنَّ اِبْنِی مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ. (هود : ۴۵)

''پروردگار اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا بیٹا میرے اہل میں
شامل ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تیرا وعدہ سچا ہے۔''

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے شفقت پدری کے ہاتھوں مجبور ہو کر عرض کیا:

''پروردگار! یہ فرزند میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا
ہے، تو نے وعدہ کیا تھا کہ تیرے اہل کو بچالوں گا۔''

اللہ جل جلالہٗ کی قہر فلک ندا آئی!

قَالَ یَا نُوحُ اِنَّهُ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ اِنَّهُ عَمِلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِهِ عِلْمٌ اِنِّیْ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِیْنَ. (هود ۴۶)

''اے نوحؑ تم یہ کیا کہہ رہے ہو، وہ ہرگز تمہارے اہل میں

شامل نہیں' (انبیاء کے اہل وہ ہوتے ہیں جو ان کی پیروی کریں) وہ بہت بد چلن ہے جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔ مجھ سے اس کے بارے میں درخواست نہ کرو' میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں کہ نادانوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔"

چنانچہ باپ کی آنکھوں کے سامنے پانی کی عظیم لہر اُٹھی جو باپ بیٹے کے درمیان حائل ہوگئی' جس نے نوح علیہ السلام کے فرزند کو غرق کر دیا۔

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ. (ھود ۴۳)

"یکا یک دونوں باپ بیٹے کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوب گیا۔"

کیا ہم شفاعت اور سفارش کے حق دار ہیں؟

یہ بات نصیحت کے طور پر عرض کرتا چلوں کہ تم جو خود کو خاتم الانبیاء والمرسلینؐ کی امت سمجھتے ہو' اور تم نے آپؐ اور آپؐ کے خاندان عصمت و طہارت سے شفاعت کی امید باندھ رکھی ہے' کیا تمہارے پاس ایسا عمل ہے جس کی بناء پر حضورؐ قیامت کے دن تمہاری شفاعت کر سکیں؟ ہمارے اعمال اس حد تک برے ہو چکے ہیں کہ ہم آپؐ کی سفارش کے حق دار نہیں رہے۔ حتیٰ کہ شافعین کی شفاعت بھی ہمارے کام نہ آ سکے گی اور اس سے بھی ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ. (المدثر : ۴۸)

"تو اس وقت سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے کچھ کام نہ آئے گی۔"

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمان گناہوں کی کثرت کی وجہ سے ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰؐ کا نام بھی بھول جائیں گے۔ کیا ایسی صورت میں اس قسم کے افراد کے لیے نجات کی امید باقی رہ جاتی ہے؟

فَفَتَحنَا اَبوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنهَمِرٍ۔

''اور ہم نے موسلادہار پانی سے آسمان کے دروازے کھول دیئے''

کسی مشک کے منہ کو کھولنے سے جس طرح پانی شدت سے خارج ہوتا ہے اسی طرح آسمان سے مسلسل چالیس دن رات موسلادھار پانی برستا رہا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مفضل سے فرماتے ہیں:

''جب بارش ہوتی ہے تو اس بات کا مشاہدہ کیا کرو کہ بارش قطروں کی صورت میں ہوتی ہے، اگر خدا حکم فرمادے اور تمام پانی یکبارگی زمین پر برس جائے جبکہ بادل ہزاروں میل ہم سے دور ہوتے ہیں تو کیا کوئی ایک فرد بھی زندہ بچ سکتا ہے؟ کیا اس طریقے سے کھیت سیراب اور سرسبز و شاداب ہو سکتے ہیں؟ الغرض ہمارا مقصود خدا کی رحمتوں کا تذکرہ کرنا اور ان نعمتوں کی شکرگزاری ادا کرنی ہے۔

ابواب السماء ایک استعارہ

بے شمار محققین نے ''ابواب السماء'' کی عبارت کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ عبارت ایک استعارہ ہے اور مجازی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی اس کا مفہوم یہ نہیں کہ آسمان کے دروازے حقیقتاً کھل گئے تھے اور پانی برسنا شروع ہو گیا تھا بلکہ اس استعارہ سے پانی کی بہتات کی جانب اشارہ ہوا ہے مثال کے طور پر بارش کی

شدت کے بارے میں بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ بارش اس شدت سے برس رہی تھی جیسا کہ پرنالوں سے پانی بہتا ہے۔ اس استعارے کا مقصد پانی برسنے کی شدت کو بیان کرنا ہے۔

وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا.

''اور ہم نے زمین سے چشمے جاری کر دیئے۔''

اس آیۂ مبارکہ میں یہ نہیں فرمایا کہ پانی کے چشمے جاری کر دیئے کیونکہ زمین کا چپہ چپہ چشمہ بن چکا تھا۔ اس طرح آسمان سے موسلادھار پانی برس رہا تھا اور زمین سے بھی پانی ابل رہا تھا۔

صادق آل محمدؑ سے ایک روایت منقول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے گھر میں آپ کی زوجۂ محترمہ نے جب اس تندور کو دیکھا کہ جو تیار کیا جا رہا تھا' تو اس میں پانی ابل رہا تھا۔ آپ نے فوراً اس بات کے بارے میں حضرت نوح علیہ السلام کو آگاہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو خدا کا وعدہ یاد آ گیا اور سمجھ گئے کہ طوفان کا زمانہ آ گیا ہے' آپ نے تندور کو ڈھانپ دیا اور اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ کشتی میں سوار ہو جائیں۔ اس طرح جو شخص آپ کی نبوت کی تصدیق کر چکے تھے نیز مختلف جانور' درندے اور حشرات الارض کشتی میں سوار ہو گئے' جب آپ کشتی میں بیٹھنے لگے تو آپ نے تندور کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ پانی تندور سے باہر کی جانب ابلنے لگا۔ بعد ازاں زمین کے چپے چپے سے پانی پھوٹنے لگا اور آسمان سے بھی موسلادھار بارش برسنے لگی گویا عذاب الٰہی کا آغاز ہو چکا تھا۔

نجات کا کلمہ

علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے ایک مستند روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''حضرت جبرئیلؑ نے حضرت نوحؑ کو اس بات سے آگاہ فرمایا کہ جب ایک کشتی میں سوار ہو جائیں اور پانی کی لہروں کی وجہ سے کشتی تلاطم میں گھر جائے تو ایک ہزار بار کلمہ لاالہ الا اللہ کا ورد فرمانا اس طرح طلاطم سے نجات حاصل ہو جائے گی۔''

چنانچہ جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی میں تلاطم برپا ہوگیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ آسمان سے بھی پانی برس رہا تھا اور زمین سے بھی ابل رہا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کلمہ لاالہ الا اللہ ہزار بار ورد کرنے کی نیت کی البتہ جب یہ محسوس ہوا کہ وقت انتہائی تنگ ہے۔ تو آپ نے سریانی زبان میں فرمایا:

''میں ہزار بار لاالہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہوں۔ جس کے نتیجے میں موجوں کا تلاطم رک گیا۔ طوفان کے خاتمے کے بعد جس وقت آپ کشتی سے باہر تشریف لا رہے تھے۔ تو آپ نے فرمایا:

''اس کلمہ نے ہمیں نجات بخشی اس لیے ہمیں اسے کبھی نہیں بھلانا چاہئے آپ نے اپنی انگوٹھی پر بھی کلمہ لاالہ الا اللہ کا نقش کندہ فرمایا:''

فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلٰى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ.

''تو ایک کام کے لیے جو مقدر ہو چکا تھا دونوں پانی آپس میں مل کر ایک ہو گئے۔''

اس آیۂ مبارکہ کے سلسلے میں محقق طبرسی فرماتے ہیں آسمان اور زمین کا پانی مل کر ایک ہو گیا چونکہ "التقی" دو کے درمیان ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں مل کر ایک ہو گئے۔

ایک روایت کے مطابق پانی زمین کی بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں سے اسی (۸۰) گز اوپر جا چکا تھا۔

آبی جانوروں کے ڈھانچے

طنطاوی رقمطراز ہیں کہ ماہرین علم طبقات الارض اور دیگر جدید محققین کا کہنا ہے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر دریاؤں کی نشانیوں اور علامات کا مشاہدہ کیا گیا ہے' یہ نشانیاں مچھلیوں اور سمندری جانوروں کے ڈھانچوں پر مشتمل ہیں۔ اس طرح یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کسی زمانہ میں یہ پہاڑی چوٹیاں زیر آب آ چکی ہوں گی۔ چنانچہ دینی نقطۂ نظر سے طوفانِ نوحؑ کے اثرات کی صداقت ثابت ہو جاتی ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک "عَلٰی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ" کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان سے برسنے والا اور زمین سے ابلنے والا پانی دونوں کی مقدار ایک تھی۔

کشتی کوہ جودی پر ٹھہرتی ہے

چالیس روز گذرنے کے بعد طوفان کا پانی جو بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں سے اسی (۸۰) گز اونچا جا چکا تھا' اصولی طور پر اسے طویل مدت میں خشک ہونا چاہیے تھا تاکہ کشتی زمین پر ٹھہرنے کے قابل ہو جائے۔ دوسری صورت میں کشتی زمین (دلدل) میں ٹھہرنے کی وجہ سے تباہ ہو جاتی لیکن حکم الٰہی ہوا کہ:

وَقِيْلَ يَا اَرْضُ ابْلَعِىْ مَآئَكِ وَ يَا سَمَآءُ اَقْلِعِىْ وَغِيْضَ الْمَآءِ وَقُضِىَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ وَقِيْلَ بُعْدًا

لِلقَوْمِ الظّٰالِمِینَ.(ھود ۴۴)

"اور جب خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور اے بارش آسمان سے برسنے سے تھم جا تو پانی گھٹ گیا اور کشتی جودی (پہاڑ) پر جا ٹھہری اور ہر طرف پکار دیا گیا ظالم لوگوں کو (خدا کی رحمت سے) دوری ہو۔"

کشتی کے اندرونی حالات

اس تمام مدت میں، جو ایک روایت کے مطابق چھ ماہ بتائی جاتی ہے، نوح علیہ السلام اور آپ کے پیروکار کشتی میں سوار رہے لہٰذا فطرتاً اور ایک مسلم امر کے مطابق کہ وہ عالم اسباب کی روز مرہ ضروریات سے بالاتر نہ تھے۔ اس تین منزلہ کشتی کو جس کی ہر منزل پانی میں غوطہ زن تھی، اندھیرے کی وجہ سے انتہائی دشوار حالات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ کشتی کی سواریاں جانوروں اور پرندوں کے فضلہ اور مدفوع کے تعفن اور سرانڈ کے سبب تنگ آ چکی تھیں، نیز کشتی میں موجود لوگوں کے ہاتھوں انہیں کافی مشکلات اور دشواریاں درپیش تھیں۔

پروردگار عالم نے جنت سے ان کے لیے دو گوہر بھیجے، ایک سے دن میں سورج کی مانند روشنی ہوتی تھی اور دوسرا رات کو چاندنی کرتا تھا اور فضلہ کے خاتمہ کے لیے سور کو پیدا کیا گیا کہ جس کا کام فضلہ کو کھانا تھا۔ جی ہاں!

یہی سور جس کے گوشت کو یورپ کے لوگ انتہائی رغبت سے نوش فرماتے ہیں، یقیناً (بَلِی اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ) گندی چیزیں گندے لوگوں کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے چوہے سے نجات کے لیے بلی کو پیدا کیا۔

کشتی نجات کے گوہر

اس اُمت ''اُمت محمدیؐ'' کی کشتی نجات (جو ولایت ہے) میں بھی دو گوہر ہیں:

یَخرُجُ مِنھُمَا اللُّؤلُؤُ وَالمَرجَانُ. (الرحمن ۲۲)

''ان دونوں دریاؤں میں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔''

جو لوگ اس امر سے بخوبی واقف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دو گوہر جوانان جنت کے سردار حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ علیہما السلام ہیں۔ تاہم خدا کے چاند کی مثال موتی کا نور یعنی حضرت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے ابر ظلمت کے اندھیرے کو مٹا دیا اور خدا کے مونگے اور مرجان یعنی حضرت سید الشہداء حسین ابن علی علیہما السلام جو سورج کی مثال ہیں ایسے انداز میں طالع ہوئے کہ بنی امیہ کے ظلمت کدہ کی تمام مشینری کو جلا کر راکھ کر دیا۔

سورۂ مبارکہ ''والفجر'' میں لفظ والفجر کی تفسیر کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے کہ فجر سے مراد نور حسین ابن علی علیہما السلام ہے۔

وَحَمَلنَاہُ عَلٰی ذَاتِ الوَاحٍ و دُسُرٍ.

''اور ہم نے اسے ایک کشتی پر جو تختوں اور کیلوں سے تیار کی گئی تھی سوار کیا۔''

اس کشتی کی تختیاں شمشاد کے درخت یا جس کا پہلے بتا چکے ہیں کھجور کے درخت کی لکڑی سے تیار کی گئی تھیں۔

لفظ ''الواح'' لوحۃ کا جمع کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں تختی اور لفظ ''دسر''

دسار کا جمع کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں کیل یا میخ۔

بعض مفسرین کے نزدیک "دسر" کشتی کا سامنے والا حصہ "سینہ" ہے اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کشتی کی بنیاد جو مضبوط لکڑیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ نیز تختے بھی مضبوط لکڑی سے تیار کئے جاتے ہیں جن کے ہمراہ دوسری لکڑیاں میخوں کے ذریعے جوڑی جاتی ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے چار پائی میں چاروں کونوں پر مضبوط لکڑی کے چار عمود لگائے جاتے ہیں' چنانچہ اس لحاظ سے آیت مبارکہ کا ترجمہ یوں ہوگا کہ ہم نے انہیں ایک ایسی کشتی پر سوار کیا جو بنیادوں اور فروع "شعب" پر مشتمل تھی۔

تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا.

"اور وہ ہماری نگرانی میں چل رہی تھی"

کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی یعنی ہماری نگرانی و سرپرستی میں پانی پر رواں دواں تھی۔

جس وقت آپ اس بات کو بیان کرنا چاہتے ہوں کہ فلاں چیز خراب اور ضائع نہ ہوگی تو کہتے ہیں کہ وہ چیز ہماری نظروں کے سامنے ہے یا ہماری نظروں میں ہے یعنی ہم اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کی حفاظت کریں گے۔ خدا کا بھی ارشاد ہوتا ہے کہ کشتی ہماری نظروں کے سامنے اور نگرانی میں چل رہی ہے چنانچہ اگر خدا اس کا محافظ اور نگہبان نہ ہوتا تو کسی صورت میں اس شدید طوفان کے ہوتے ہوئے کشتی کا بچنا محال تھا۔ بعض مفسرین بیان کرتے ہیں کہ "اعیننا" سے مراد اولیاء اللہ' الٰہی محافظ اور خدا کے طاقتور کارندے ہیں۔

اور یہ تمام کے تمام خدا کے پاسبانوں اور محافظوں کا درجہ رکھتے ہیں' لہٰذا

"تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا" کا مفہوم یہ ہوگا "بِحِفْظِ مَلَائِکَتِنَا بِاَیَادِی اَولِیَائِنَا وَعَمَالِنَا"

جیسا کہ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر خدا کا ارشاد ہوتا ہے کہ:

لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ. (الرعد: ۱۱)

"آدمی کسی حالت میں ہو مگر اس کے لیے اس کے آگے اس کے پیچھے اس کے نگہبان "فرشتے" مقرر ہیں کہ اس کی حکم خدا سے حفاظت کرتے ہیں"

یہ فرشتے آدمی کی تادم مرگ حفاظت کرتے ہیں اور اگر خدا کے یہ محافظ آدمی کے ساتھ نہ ہوتے تو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک تمام تر مہمات اور خطروں کے باوجود کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا۔

جَزَاءً لِّمَنْ کَانَ کُفِرَ.

"اس شخص (نوح علیہ السلام) کا بدلہ لینے کے لیے جس کو لوگ نہ مانتے تھے۔"

"من" موصولہ سے حضرت نوح علیہ السلام کی جانب اشارہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی اور نعمت نہیں ہو سکتی۔ جو افراد لوگوں کو خدا کے اوامر و نواہی پر عمل کرنے کی طرف دعوت دیتے ہیں ان کی دعوتِ عمل دوسری تمام نعمتوں پر بھاری ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا.

(آل عمران ۱۶۴)

"خدا نے تو ایمان والوں پر بڑا احسان کیا ہے ان کے واسطہ

انہیں کی قوم کا ایک رسولؐ بھیجا۔''

جبکہ اپنی نعمتوں میں سے کسی بھی لامتناہی نعمت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ یہ میرا لوگوں پر احسان ہے۔

لہٰذا اگر کوئی ایسی نعمت کے بارے میں کفر کا راستہ اختیار کرے یا بہ الفاظ دیگر وہ کفران نعمت کرے تو کیا وہ ایسی سزا اور عذاب کا مستحق ہے یا نہیں؟

چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم بجائے اس کے کہ وہ اس عظیم نعمت کی شکر گذاری اور قدردانی کرتی اور اس سے فائدہ اُٹھاتی ' کفر کی راہ پر گامزن ہوئی اور پانی میں ڈوبنے کی سزا کی مستحق ٹھہری۔

ہم پروردگار عالم کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری اسلام کی (نعمت کی) جانب رہنمائی فرمائی اور اگر اس کی عطا کردہ ہدایت و رہنمائی ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو ہم کیونکر ہدایت پاتے؟

وَقَالُوا الْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ. (الاعراف :۴۳)

''اور کہتے ہیں کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں اس منزل مقصود تک پہنچایا اور اگر خدا ہمیں یہاں نہ پہنچاتا تو ہم کسی طرح یہاں نہ پہنچ سکتے۔''

اس آیہ مبارکہ سے جو ہمیں سبق اور نصیحت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص حضرت ختمی مرتبتؐ کی رسالت کی نعمت عظمیٰ کے بارے میں کفران نعمت کا ارتکاب کرے کیونکہ اگر ایسا کرے تو وہ عذاب الٰہی کا سزاوار ٹھہرے گا اگر چہ اب حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کی برکتوں' رحمتوں اور فیوضات کے سبب عذاب

نازل نہیں ہوتا۔

نعمتوں کے بارے میں باز پرس کی جائے گی

قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے:

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ. (التکاثر ۸)

''پھر تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور باز پرس کی جائے گی۔''

بعض عام مفسرین اس آیۂ مبارکہ کی وضاحت کے ضمن میں فرماتے ہیں ''النعیم'' سے مراد ٹھنڈا پانی ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ س لفظ سے مراد روٹی ہے اور بعض دیگر مفسروں کا بیان ہے کہ یہ لفظ خواب ''نیند'' کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ایک روایت کے مطابق خدا اس بات سے برتر اور عظیم تر ہے کہ پانی، روٹی اور نیند وغیرہ کی مانند نعمتوں کے بارے میں باز پرس فرمائے، چنانچہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کوئی احسان کرتا ہے اور بعد میں احسان کرنے والا احسان مند سے سوال کرے کہ تم نے میرے کئے ہوئے احسان کے سلسلے میں کیا رویہ اختیار کیا تو یقیناً یہ انتہائی معیوب، ناپسندیدہ اور کمینگی سمجھی جائے گی۔ کیا اس قسم کے عیب یا برائی کو آپ خدا سے منسوب کرتے ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا:

''ہرگز نہیں البتہ جس نعمت کے بارے میں قیامت کے دن باز پرس ہوگی وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

''وہ آل محمد علیہم الصلوۃ والسلام کی ولایت ہے۔''

قرآن مجید کے ایک اور مقام پر واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے: انبیاء کی نعمت کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔ انسانوں سے پوچھا جائے گا: کیا تم نے انبیاء کی اطاعت کی؟ اسی طرح انبیاء سے بھی باز پرس کی جائے گی کہ کیا خدا کے احکام کو لوگوں تک پہنچایا یا نہیں؟

انبیاء کی نعمت کا انکار اور کفران نعمت

دین سے انکار دراصل انبیاء کی صداقت اور سچائی سے منکر ہونے کے مترادف ہے۔ مساجد کا ترک کر دینا' علماء کی محفلوں میں نہ جانا دراصل دین سے بے پروائی ہے۔ اوامر و نواہی کے سلسلے میں لا ابالی پن ہے اور یہ تمام کی تمام انبیاء کی صداقت اور سچائی کا انکار ہے۔ اب جبکہ انبیاء خدا کی عظیم ترین نعمت ہیں اس لیے انبیاء سے انکار بھی کفران نعمت ہے۔

علانیہ طور پر گناہ کا ارتکاب کرنا کھلم کھلا کفران اور بے راہ روی ہے۔ ایسا گناہ عذاب اور مواخذہ کا مستحق ہے' جس شہر میں منشیات اور شراب کا لین دین آزادانہ طور پر اور بے روک تھام جاری ہو' پردے اور حجاب کی آیات کی خلاف ورزی ہوتی ہو اور ان کے برعکس عمل ہوتا ہو' گانوں اور موسیقی کی صدائیں ہر دکان اور ہر گھر سے سنائی دیتی ہوں' ریا اور منافع خوری علانیہ طور پر جاری ہو وغیرہ' تو اس شہر کے لوگ عذاب و سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔

لَوْلاَ شَبَابٌ خُشَّعٌ وَ شُيُوْخٌ رُكَّعٌ وَ اَطْفَالٌ رُضَّعٌ لَصُبَّ الْبَلاَءُ عَلَيْكُمْ صَبًّا.

"اگر حالت خشوع و خضوع پر قائم رہنے والے جوان اور

حالت رکوع میں رہنے والے بزرگ اور معمر افراد اور شیر خوار نہ ہوتے تو یقیناً تم پر عذاب نازل ہوتا جیسا کہ نازل ہونے کا حق ہے۔"

یہ ان کی برکتیں اور فیوضات ہیں کہ عذاب ٹل جاتے ہیں۔لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کرلیں کہ ہر چیز اگر اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو اس قسم کے افراد بھی فتنوں اور عذاب کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں خدا کا ارشاد ہوتا ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّاتُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً.

(الانفال: ۲۵)

"اور اس فتنے سے ڈرتے رہو جو صرف (خاص) انہیں لوگوں پر نہیں پڑے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے بلکہ تم سب اس میں پڑ جاؤ گے۔"

جی ہاں یہی ہوتا ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا انجام۔

مثال کے طور پر جو شخص اپنے آپ کو دیندار اور پارسا سمجھتا ہے تو پھر وہ بے پردہ خاتون کے ہمراہ جو علانیہ طور پر بدچلن ہو کیوں چلتا ہے؟ یا موسیقی کی دکان جہاں سے گانوں کی آواز آتی ہے اس کے ساتھ لین دین کیوں کرتا ہے اور اس حمام میں جہاں گانے ٹیپ پر چل رہے ہوں کیوں جاتا ہے؟

نہی عن المنکر

اگر آپ دیندار حضرات اس قسم کے لوگوں سے لین دین کرنا بند کر دیں (یعنی جو لوگ دین کے بارے میں بے پروا اور لاابالی ہیں اور صرف مال دنیا کے غلام ہیں اور مال وزر دنیا سے پوجا کی حد تک محبت کرتے ہیں) تو یقین کیجئے کہ منکرات اور برائیاں کم ہوجائیں گی۔ لہٰذا آپ کیونکر اس سلسلے میں سہل پسندی سے کام لیتے ہیں یہ برائیوں سے روکنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک یہ رویہ اختیار نہیں کیا تو مستقبل کے لیے یہ فیصلہ کریں کہ برائیوں اور منکرات کی روک تھام کے لیے عملی طور پر میدان میں آ جائیں اور اس بات کا مشاہدہ کریں کہ آپ کے اس اقدام سے برائیوں میں کس حد تک کمی واقع ہوتی ہے۔ اگر اس طریقے سے برائی اور منکر کی مکمل بیخ کنی نہیں ہوتی تو کم از کم برائیوں میں کمی تو ضرور واقع ہوگی نیز علانیہ طور پر برائیوں کے ارتکاب میں بھی کمی ہو جائے گی۔

کشتی عبرت کے لیے باقی رہتی ہے

وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً.

''اور ہم نے اس کو ایک عبرت بنا کے چھوڑا''

مختلف تفسیروں میں اس بات کا بیان کیا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی کوہ جودی پر ٹھہرنے کے بعد، خدا نے اس کی حفاظت فرمائی اور خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰؐ کے زمانے تک اسی طرح باقی رہی جبکہ یہ کشتی صرف لکڑی اور تختوں سے تیار کی گئی تھی۔ حالانکہ طوفان نوحؑ کو پانچ ہزار آٹھ سو سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد اس کا باقی رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے کیونکہ لکڑی اور لکڑی کے تختے اس حد

تک پائیدار ثابت نہیں ہوتے۔ لیکن پروردگار عالم نے دوسروں کی عبرت کے لیے اس کی حفاظت کی اور اسے باقی رکھا۔

ایک مفسر بیان فرماتے ہیں کہ کشتی نوحؑ کے مختلف ٹکڑوں کا میں نے بذات خود مشاہدہ کیا ہے۔ نیز کچھ عرصہ پہلے ایک شخص یہ بات نقل کر رہا تھا کہ اس نے ایک رسالہ میں یہ پڑھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی دریافت ہو گئی ہے۔ بہر حال پروردگار عالم فرماتا ہے کہ ہم نے اس کو دوسروں کے لیے عبرت کے طور پر چھوڑا ہے اور اسے باقی رکھا تاکہ دوسرے لوگ بھی یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اگر انہوں نے اس عظیم نعمت کا حضرت خاتم الانبیاء والمرسلینؐ کے سلسلے میں کفران کیا تو وہ بھی قہر و عذاب الٰہی کے سزاوار و مستحق ٹھہریں گے۔

دوسری تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسانوں کے ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کی داستاں اور روداد کی جانب رجوع کر سکیں یعنی ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی داستاں کو تمہارے لیے باقی رکھا تاکہ تمہارے لیے عبرت اور سبق بن جائے۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ.

''تو کوئی ہے جو عبرت حاصل کرے۔''

یعنی اس سے عبرت و سبق حاصل کرنے والا محو خواب گوشش نہ رہے بلکہ خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَ نُذُرُ.

''تو ان کو میرا عذاب اور ڈرانا کیسا تھا؟''

اس آیۂ مبارکہ میں تعظیم و تعجب کو ظاہر کرنے کے لیے استفہامیہ اسلوب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یعنی اے سننے والے! اے وہ شخص جو نوحؑ کی داستان سے

باخبر ہے، قہر و غضب و عذاب الٰہی کیا ہے؟ ہمارا ڈرانا کیسا ہے؟ تو کوئی ہے جو ڈر جائے اور خوف لاحق ہونے کے بعد اپنی نیند اور خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔

تمام لوگوں کی موت (تمام لوگ مر جاتے ہیں)

نوح علیہ السلام کے پیرو طوفان کے ختم ہونے پر ان سے کھانا طلب کرتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام ریت کی ایک مقدار لے کر اس پر خدا کا نام پڑھتے ہیں تو وہ تمام ریت گندم ہو جاتی ہے اور آپؑ اس کو اپنے ماننے والوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ بعد میں آپؑ کچھ لکڑیاں لے کر زمین میں پیوست کر دیتے ہیں اور وہ درختوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح آپ کے پیرو عمارتیں تعمیر کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ عمارتوں کی تعمیر کے بعد وہ علاقہ ایک بستی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ بستی بعد میں "مَدِیْنَةُ الثَّمَانِیْنَ" یعنی اسی (۸۰) لوگوں والی بستی یا شہر کے نام سے مشہور ہوتی ہے۔ بعد ازاں ایک وبا پھوٹ نکلتی ہے جو تمام لوگوں کو اپنا لقمہ بناتے ہوئے انہیں ابدی نیند سلا دیتی ہے، تاہم صرف تین افراد اس وبا کے ہاتھوں بچ نکلتے ہیں۔ یہ تین افراد حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے ہوتے ہیں اور انہیں سے نسل انسانی کا سلسلہ چل نکلتا ہے، اسی بناء پر حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

مختلف تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تینوں افراد دنیا کے الگ الگ خطوں کی جانب روانہ ہوئے تھے اور جہاں پر ان کے ذریعے جداگانہ انسانی نسلیں وجود میں آئیں۔ اس سلسلے میں علامہ مجلسی نے اپنی کتاب حیاۃ القلوب میں بعض واقعات کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔

قرآن مجید نصیحت حاصل کرنے کے واسطے ہے

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ.

''اور ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے واسطے آسان کر دیا ہے۔''

مُدَّکِر اور مُتَذِکّر باب افتعال سے ہیں اور دونوں الفاظ میں ایک ہی معنی مضمر ہیں۔

قرآن مجید اس نہج پر نازل ہوا ہے کہ پروردگار عالم کا کلام ہونے کے باوجود آسان اور سلیس عبارتوں پر مشتمل ہے تا کہ ہر انسان اپنے شعور و ادراک کی سطح کے مطابق اس سے استفادہ کر سکے۔ قرآن کی آیات اس حد تک رواں دواں' سلیس اور فصاحت و بلاغت کی مرقع ہیں کہ جو شخص بھی عربی زبان سے معمولی سا واقف ہو وہ اس سے ایک حد تک مستفید ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ آسان و سلیس ہونے کے باوجود کوئی شخص اس کی مثال پیش کر سکا اور نہ پیش کر سکتا ہے۔

قرآن مجید بار بار بیان کی جدت اور کشش کو قائم رکھنے کے لیے گذشتہ اور سابقہ قوموں کی داستانیں اور قصے بیان فرماتا ہے تا کہ انسان اس سے کسی نہ کسی طرح عبرت حاصل کرے۔ یاددھانی ہوتی رہے اور نصیحت حاصل کی جائے۔

فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِر.

''تو کوئی ہے جو عبرت حاصل کرے۔''

اس کے بعد گذشتہ عبارت دوبارہ دہرائی گئی ہے یعنی کوئی ہے جو نصیحت

حاصل کرے۔ ہمیں قرآن مجید سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔ اس کلام پاک سے ہمہ وقت نصیحت حاصل کرنے کی گنجائش باقی رہی ہے اور رہے گی۔ انسان کسی بھی مرحلے میں ہو وہ اس سے سبق لے سکتا ہے اور اگر وہ اس سے کسی نصیحت کو حاصل کر چکا ہے اس کے باوجود اس کا فکر و ادراک جس حد تک بھی بلند مدارج کو طے کر چکا ہے تب بھی وہ اس سے مزید بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں بیان ہوتا ہے کہ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِر کا مفہوم یہ ہے کہ کیا کوئی علم و دانش کا طالب ہے جو آ کر قرآن علم و دانش سے فائدہ حاصل کر سکے۔

''ذکر'' کے معنی ہیں یاد اور اس لفظ کی ضد ''نسیان'' یعنی ''بھول'' ہے۔ درحقیقت یہ ایسی بات ہے جو انسانی ذہن میں ہے لیکن فی الوقت اسے یاد نہیں رہا دراصل قرآن مجید اور اہل بیت اطہار علیہم السلام اور دوسرے بزرگان دین کے اقوال زریں انسانی فطرت میں موجود ان باتوں کی یاد دہانی کے لیے ہیں جنھیں وہ بھول گیا ہے یا جن پر غفلت کے پردے پڑ چکے ہیں تاہم یہ یاد دہانی ایسے دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے جو نور ایمان اور علم و دانش کی روشنی سے منور ہو چکے ہوں۔

سننے والے میں اثر آفرینی اور مستعدی ہونی ضروری ہے

اگر خدانخواستہ کسی شخص کے دل میں نورانیت جاتی رہی تو ذکر اور یاددہانی سے فائدہ حاصل نہ ہوگا قرآن مجید ایسے شخص کو کیا یاد دلائے؟

جو شخص بصارت سے محروم ہے روشنی ہونا یا نہ ہونا کا عمل اس پر کسی طور سے اثر انداز نہیں ہو سکتا وہ بصارت سے محروم ہے اور اسے کچھ بھی بجھائی نہیں دیتا تاہم اگر کسی شخص کی آنکھوں کا نور قائم ہے اور اندھیرے میں ہے تو جب کوئی چراغ

اس کے سامنے آئے گا تو اسے نظر آنے لگے گا۔ اس طرح پروردگارِ عالم نے بھی حضرت نوح علیہ السلام کی داستاں بھی عبرت و نصیحت کے حصول کے لیے بیان فرمائی ہے۔ اب اگر کسی شخص پر یہ واقعہ اثر انداز نہیں ہوتا تو اس شخص کی ذاتی کمبختی اور بدنصیبی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی داستاں کا انہی آیات مبارکہ پر اختتام ہوتا ہے یہاں پر جس بات کو ایک بار پھر دھرانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا یہ طوفان صرف حضرت نوح علیہ السلام کے علاقے ہی میں آیا تھا یا یہ واقعہ پورے کرہٴ ارض پر رونما ہوا تھا؟ اور اگر تمام کرہٴ ارض اس طوفان کی زد میں آیا تھا تو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم تو کوفہ میں رہتی تھی اس لیے تمام کرہٴ ارض اس طوفان کی زد میں کیونکر آیا اور تمام لوگ کیوں ہلاک کیئے گئے؟

طوفان کس مقام پر آیا تھا؟

گو کہ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "طوفان نوح" علیہ السلام قوم نوح علیہ السلام کے علاقے میں ہی آیا تھا، تاہم یہ بات ان آیات میں نہیں آئی اور اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایات کے برخلاف ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے سوا تمام زمین پانی کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ اسی بناء پر خانۂ کعبہ بیت العتیق یعنی پرانے گھر کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ (گویا خانۂ کعبہ کی بنیادیں اس طوفان سے متاثر نہیں ہوئی تھیں۔) اس سلسلے میں بے شمار روایات موجود ہیں اور علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار الانوار میں اس کے بارے میں تمام روایتیں اکٹھی فرمائی ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سمندری جانوروں کی نشانیاں ''ڈھانچے ہڈیاں وغیرہ'' بھی علم طبقات الارض کے ماہرین کی جدید تحقیقات کے مطابق دریافت ہوئی ہیں جو بذات خود اس امر کی دلیل ہے کہ کسی زمانہ میں پانی بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچا تھا جس کی وجہ سے ان نشانیوں کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اگر قوم نوح علیہ السلام کوفہ اور نینوا کے علاقوں میں آباد تھی تو تمام زمین کے لوگوں کو کیوں غرق کیا گیا؟ اس سلسلے میں حقیر کا خیال ہے کہ عقلی دلائل، قرآنی آیات اور منقول روایات کے مطابق پروردگار عالم جب تک کسی پر اپنی حجت قائم نہیں فرماتا وہ ہلاک نہیں کرتا اور جب تک صحیح راستہ کی جانب ہدایت و رہنمائی نہیں فرماتا کسی پر کوئی عذاب نازل نہیں کیا جاتا:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلاً .

''اور ہم جب تک رسولؐ کو بھیج کر حجت تمام نہ کر لیں، کسی پر عذاب نازل نہیں کیا کرتے۔'' (بنی اسرائیل: ۱۵)

جب کوئی قوم کفران نعمت کرتی ہے اور اپنی حدوں سے تجاوز کر لیتی ہے تو عذاب نازل ہوتا ہے۔ اب اس تمہید کے بعد یہ بتاتے چلیں کہ

کرۂ ارض پر زمین کے تمام علاقے آباد نہ تھے

ناسخ میں بیان کیا گیا ہے کہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلاما لسلام کے زمانے تک کا عرصہ دو ہزار دو سو اڑتالیس (۲۲۴۸)

سال پر محیط ہے اس لیے اس قلیل مدت میں حتمی طور پر تمام کرۂ ارض آباد نہ ہوگا اور ایسی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی کہ کرۂ ارض کے تمام علاقے آباد تھے۔ بلکہ کرۂ ارض کا صرف ایک حصہ آباد تھا جبکہ یہ یقینی بات ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جو خدا کے صاحب شریعت اور اولوالعزم پیغمبر تھے اور اس زمانے کے تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے منتخب کئے گئے تھے اپنی نبوت کے طویل عرصہ میں، جو نو سو پچاس (۹۵۰) سال پر محیط ہے، حتمی طور پر گردونواح کے دور دراز علاقوں کی جانب اپنے نمائندے روانہ کئے ہوں گے یا آپؑ نے بذات خود سفر اختیار کیا ہوگا نیز یہ کہ تمام دیگر لوگوں پر حجت تمام کی گئی ہوگی۔ کیونکہ آپ کو خدا نے صرف کوفہ ونینوا کے لوگوں کی ہدایت کے لیے ہی نہیں بھیجا تھا۔

حضرت سام، حضرت نوح علیہ السلام کے وصی اور جانشین تھے

نوحؑ علیہ السلام کے تین فرزند نیک تھے۔ یہ تینوں فرزند صاحب ایمان تھے۔ رسالت کی تبلیغ و ترویج کے سلسلے میں آپ کے معاون و مددگار بھی رہے، یہاں تک کہ جناب سام حضرت نوح علیہ السلام کی جانشینی کے عہدہ پر بھی فائز تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس فرزند کو اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں ایک وصیت کے مطابق اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا اور صرف آپؑ کا چوتھا بیٹا جس کا نام ''کنعان،، تھا کفر کی راہ پر گامزن تھا اور یہ بیٹا طوفان میں غرق کر دیا گیا تھا۔

یہ بات بعید نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو یا دیگر

اعزاء و اقارب نیز پیرووں کو اتمام حجت کی خاطر گرد و نواح میں واقع علاقوں یا بستیوں میں روانہ کیا ہو۔ اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ کے نمائندوں کو بھی اسی نوع کے مظالم اور ایذا رسانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو، جس نوع کی اذیتیں اور صعوبتیں خود آپؐ کو برداشت کرنی پڑیں تھی اور اس طرح وہ (ایذا رسانی کرنے والے)لوگ بھی اپنے آپ کو مستحق عذاب ٹھہراتے گئے ہوں۔

بہرکیف اس بات پر ہمارا مکمل یقین ہے کہ خدا جب تک اتمام حجت نہیں فرماتا کسی پر، عذاب نازل نہیں کرتا۔

قوم عاد کی داستان

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُر.

''عاد کی قوم نے اپنے پیغمبر کو جھٹلایا تو ان کو میرا عذاب اور ڈرانا کیسا تھا''

پروردگار عالم قوم نوح علیہ السلام کے حالات و واقعات کو اپنے بندوں کو ڈرانے اور خائف کرنے کے لیے اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد ان کو مزید خائف کرنے کے لیے قوم عاد کی داستان کی جانب اشارہ فرماتا ہے تاکہ لوگوں کی خاص طور پر جزیرۃ العرب کے لوگ جو سفر کے دوران ان قوموں کی بستیوں سے گذرتے تھے ۔گمراہی اور بے پروائی کی زندگی سے آزادی کا موجب بن سکے' کیونکہ قوم عاد کا مسکن حضرموت اور یمن کے علاقے پر مشتمل تھا۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ عَادٍ.

''قوم عاد نے اپنے پیغمبر کو جھٹلایا۔''

اس قوم نے حضرت ھود علیہ السلام کو جھوٹا اور فریبی قرار دیا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ ان پر ان کے عہد رسالت میں بے شمار مظالم ڈھائے اور ہر قسم کی اذیتیں

پہنچائیں۔ ایک روایت کے مطابق ایک دن انجام سے بے خبر اس قوم کے افراد نے حضرت ھود علیہ السلام کی گردن مبارک کو اپنے ہاتھوں سے اس شدت کے ساتھ دبایا کہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے' چنانچہ انہیں اسی حالت میں بے یارو مددگار چھوڑ دیا لیکن پروردگار عالم نے آپ کو شفایاب اور تندرست وتوانا فرما دیا۔ قوم نے از سر نو حضرت ھود علیہ السلام کو اپنی اذیتوں کا نشانہ بنایا اور ایک مرتبہ آپ کو اتنا زیادہ زدو کوب کیا گیا کہ آپؑ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

اس قوم کے لوگ حضرت ھود علیہ السلام سے کہتے تھے تم تو اچھے بھلے آدمی تھے یکا یک یہ تمہیں کیا ہو گیا کہ ہمیں کہنے لگے ہو آؤ ہم سب مل کر خدائے وحدہ لا شریک کی بندگی کریں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دیوتاؤں نے تمہیں دیوانہ کر دیا ہے اسی لیے اس قسم کی باتیں کرنے لگے ہو نعوذ باللہ من ذلک لیکن حضرت ھود علیہ السلام اپنی قوم کی تمام گستاخیوں اور مظالم کے باوجود پھر سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں دیوانہ نہیں ہوں اور مجھے پروردگار عالم نے تمہاری ہدایت اور اس کے عذاب وقہر سے باخبر اور آگاہ کرنے کے لیے تمہاری طرف بھیجا ہے ورنہ تم نوح علیہ السلام کی قوم کی طرح قہر وغضب الٰہی کا نشانہ بن جاتے۔ اس قوم کے لوگ ھود علیہ السلام کے جواب میں کہتے تھے کہ نوح کی قوم کے دیوتا جھوٹے تھے جبکہ ہمارے دیوتا قد آور' اور عظیم الجثہ ہیں۔''

بحار الانوار میں منقول علامہ مجلسی کی ایک روایت کے مطابق حضرت ھود

علیہ السلام اپنی قوم کو مسلسل سات سو پچاس (۷۵۰) سال تک ہدایت فرماتے رہے' لیکن اس بدنصیب قوم کو ہدایت نصیب نہ ہوئی۔ ھود کی قوم ہر قسم کی نعمتوں سے سرشار تھی۔ ان کو میٹھا پانی اور طرح طرح کے پھل میسر تھے لیکن وہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی انتہائی طاقتور اور عظیم الجثہ تھے۔ اس قوم کے افراد کی طاقت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پہاڑوں سے چٹانوں کو اُکھاڑ کر ان سے اپنے گھروں کی چھتوں کو تیار کرتے تھے۔ اس قوم کے لوگوں کے قد بارہ گز سے لے کر ستر گز بتائے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی قوم کو جتنا بھی قہر و غضب اور عذاب الٰہی سے ڈرایا اس قوم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی الْبِلَادِ.

''ارم والے دراز قد جن کا مثل تمام دنیا کے شہروں میں کوئی پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ (الفجر: ۷'۸)

فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَ نُذُرِ.

''تو (انکو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا تھا۔''

پروردگار عالم نے قوم عادؑ کو بتدریج اپنے عذاب وقہر کا نشانہ بنایا۔ ابتداء میں بارشوں میں کمی واقع ہوئی چنانچہ وہ مسلسل تین برس تک خشک سالی سے دو چار ہوئے جس کے نتیجے میں قحط سالی اور مہنگائی میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا گیا' لیکن بدبخت اور انجام سے بے خبر اس قوم کے لوگوں نے کوئی نصیحت نہ پائی اور اپنی سابقہ بداعمالیوں پر نادم نہ ہوئے اور حضرت ھود علیہ السلام کی صداقت کو تسلیم نہ کیا' بلکہ ان کا نخوت وغرور اور زیادہ ہوتا چلا گیا۔ دراصل اس قوم کے لوگوں کو اپنی مضبوطی اور تنومندی پر بے حد گھمنڈ تھا۔ دوسرا عذاب یہ تھا کہ خدا نے ان کی جسمانی طاقت اور

دراز قدی اور تنومندی کے شروع اور گھمنڈ کو خاک میں ملانے کے لیے کمزور ترین حشرات الارض ان پر مسلط فرما دیئے۔ اس زمانے میں چیونٹیوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اس قوم کے لوگ جہاں پر بھی بیٹھتے تھے چیونٹیاں ان کے جسموں پر چڑھ جاتی تھیں، بعض چیونٹیوں کا ڈنگ ہوتا ہے اور اگر جسم کے کسی حصہ پر وہ کاٹ لیتی یا ڈنگ مار دیتی تو شدید اذیت و تکلیف ہوتی تھی۔ بہر حال معلوم نہیں کہ یہ کس نسل کی چیونٹیاں تھیں۔ مختصراً اس قوم کے لوگوں کو اس مصیبت سے اس درجہ اذیت پہنچی کہ قوم کے بعض متمول اور امیر افراد غاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے، بد نصیب اور کمبخت افراد کو غاروں میں رہنا منظور تھا لیکن حضرت ھود کے سچے پیغام پر جو ذاتِ وحدہ لاشریک کی بندگی کی جانب دعوت دے رہا تھا صدائے لبیک کہنے پر آمادہ نہ تھے۔

ریت کی آندھیوں کا آغاز

عذاب الٰہی کی شدت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا اور مکمل عذاب نازل ہونے کے دن قریب آچکے تھے۔ کئی روز تک تیز ہوائیں اور آندھیاں چلتی رہیں، جن کے ہمراہ شہر کے گرد و نواح کی ریت آتی رہی، جس کے شہر میں ڈھیر بنتے چلے گئے۔ ان آندھیوں اور تیز ہواؤں کی وجہ سے شہر میں ریت کے ٹیلے بن گئے۔ شہر میں ریت جمع ہونے کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ ادھر حضرت ھود علیہ السلام کو وحی الٰہی کے ذریعے باخبر کیا گیا کہ آسمان سے عذاب کا نزول قریب الوقوع ہے۔ چنانچہ حضرت ھود علیہ السلام نے قوم عاد کو ایک بار پھر وعظ و نصیحت کی اور ان کو بداعمالیوں کے خطرناک انجام اور نتائج سے ڈرایا اور ان سے فرمایا کہ تمہیں ریت کی

تیز ہواؤں اور آندھیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔اس لیے اپنی بداعمالیوں اور کوتاہیوں سے تائب ہو کر خدائے یگانہ پر ایمان لے آؤ۔لیکن حضرت ھود کا ڈرانا دھمکانا قوم عاد پر اثر انداز نہ ہوا' کیونکہ انہیں اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا اور وہ ریت میں ٹانگیں پیوست کرتے ہوئے کہتے رہے کہ کون ہمیں اپنی جگہ سے حرکت دے سکتا ہے۔اس طرح خدا کے عذاب کا وقت آ گیا تھا۔

اِنَّا اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡھِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا

''ہم نے ان پر زناٹے کی آندھی چلائی۔''

مجلسی علیہ الرحمہ کی حیاۃ القلوب میں رسول خداؐ سے ایک روایت کے مطابق ہوائیں سوئی بھر اپنے مقررہ اندازہ سے زیادہ نہیں چلتیں، لیکن عادؑ کے زمانے میں ہواؤں کے خزانچی فرشتوں کی مقررہ مقدار سے سوئی کی نکیل سے خارج ہونے والی ہوا کے اندازہ کے مطابق زیادہ ہوگئی تھیں' جس کے نتیجے میں قوم عاد تباہ و برباد ہوگئی تھی اور ایک روایت میں منقول ہے کہ اگر ہوا کو انگوٹھی کے حلقہ کے اندازہ کے مطابق زیادہ مقدار میں چلنے کی اجازت دی جائے تو زمین پر تمام موجودات پوری طرح تباہ و برباد ہو جائیں۔ روز مرہ کی ہوائیں رحمت الٰہی ہیں۔ خدا ہمیں اپنی پناہ میں رکھے کہ اگر کسی دن پروردگار عالم کی مشیت پہ ٹھہر جائے کہ اپنے غضب کی ہواؤں سے قوم عاد کے مانند کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرمالے۔

''صرصر'' یعنی انتہائی ٹھنڈی اور سرد ہوا' ان پر انتہائی سرد ہوائیں چلائیں۔

صرصر کا ایک اور مفہوم بھی ہے کہ وہ ہوا جو زناٹے اور آواز کے ساتھ چلتی ہو' اس بات کا آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ بعض اوقات ہوا چلتے وقت اس کے ناٹے کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہے۔

فِیۡ یَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ.

''بہت سخت منحوس دن میں''

یہ عذاب دوپہر کو آیا تھا جو پروردگار عالم کی جانب سے قہر وغضب کا دن ٹھہرا تھا۔ روایات میں منقول ہے کہ صفر کے آخری بدھ کے روز ہوائیں چلنے کے سلسلے کا آغاز ہوا' لہٰذا اس زمانے کے لوگوں نے اس دن کو ایک منحوس دن سے تعبیر کیا تھا لیکن ہر بدھ کو نحس قرار دینا افراط اور مبالغہ آرائی ہے' چنانچہ بدھ کی رات کو کسی سے ملاقات یا بیمار کی عیادت کے لیے نہیں جانا چاہیے اس قسم کی باتوں کا کوئی ثبوت یا دلیل موجود نہیں ہے' یہاں تک کہ پیر کے روز آغاز سفر کے بارے میں صادق آل محمدؑ علیہ السلام سے جب سوال کیا گیا کہ اگر اس روز سفر کرنا مجبوری بن جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ تو آپؑ نے فرمایا خدا پر توکل کرو اور سفر اختیار کر لو۔ نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صدقہ بھی نحوست کے اثرات کو ختم کر دیتا ہے۔

''مستمر'' یعنی مسلسل۔ یہ نحوست قوم عاد کی ہلاکت تک مسلسل طور پر جاری رہی۔ یہ نحوست ماہ صفر کے آخری بدھ کے دن شروع ہوئی اور دوسرے بدھ تک جاری رہی۔ یہ ہولناک آندھی یا ہوا ''دن رات'' جاری رہی۔

فِیۡ سَبۡعِ لَیَالٍ وَّ ثَمٰنِیَۃِ اَیَّامٍ.

''سات رات اور آٹھ دن۔''

ابتداء میں وہ لوگ آندھی کے سامنے کھڑے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مزاحمت کر پائیں گے یہاں تک کہ وہ لوگ اپنی ٹانگوں کو گارے اور ریت میں پیوست کر لیتے تھے لیکن قہر وغضب الٰہی کی آندھی انہیں زمین سے اُکھاڑ کر اتنی بلندی پر لے جاتی کہ وہ چڑیا کی مانند چھوٹے محسوس ہوتے تھے۔ بعد میں انہیں

شدت کے ساتھ زمین پر پٹخ کر ان کے اجسام کو ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔

ایک روایت کے مطابق قوم عاد کے سات سرداروں نے جب یہ دیکھا کہ وہ شہر اور عمارتوں میں زندگی نہیں گزار سکتے تو اپنے مال و متاع اور بیوی بچوں سمیت انہوں نے پہاڑ کی دراڑوں میں پناہ لی۔ لیکن عذاب الٰہی سے بھلا کون بچ سکتا ہے، چنانچہ شدید ہوا انہیں کی پشت سے آ کر بلند ہوتی اور انتہائی طاقت سے زمین پر پٹخ ڈالتی جبکہ وہ لوگ جو غاروں میں چلے گئے تھے پیاس اور بھوک کی شدت سے ہلاک ہو چکے تھے۔ اس طرح قوم عاد کا کوئی فرد بھی زندہ نہ بچا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

''کیا تم ان میں سے کسی کو زندہ ''باقی'' دیکھتے ہو۔؟''

منہج الصادقین میں منقول ہے کہ عمرو بن خلود، حارث بن شداد، ہلقان اور خلجان ایک غار کے دروازہ پر آ کھڑے ہوئے تا کہ اندھی ان کے اصحاب خانہ کو ہلاک نہ کر پائے لیکن آندھی کی شدید ہوا انہیں ایک ایک کر کے بلند کرتی اور پہاڑ کی چٹان سے جا پٹختی یہاں تک کہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

فَهَلْ تَرَىٰ لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ.

''تو کیا ان میں سے کسی کو بھی بچا کھچا دیکھتا ہے؟''

آخر کار قوم عاد میں سے کوئی بھی نہ بچ سکا اور تمام کے تمام لوگ ہلاک ہو گئے اور دوسروں کے لیے عبرت کی نشانی بن گئے۔

تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ.

''جو لوگوں کو (اپنی جگہ سے) اس طرح اُکھاڑ پھینکتی تھی گویا وہ اُکھڑے ہوئے کھجور کے درخت کے تنے ہیں۔''

''اعجاز'' لفظ عجز کا جمع کا صیغہ ہے یعنی درخت کا اوپر کا حصہ' چنانچہ جب درخت کی شاخیں اور پتے درخت سے چھانٹ دیئے جائیں تو درخت کیسا ہوتا ہے؟ اس سے قبل اس امر کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ قوم عاد کے لوگ انتہائی دراز قد' قوی ہیکل اور طاقتور لوگ تھے اور ان کے قد بارہ گز سے کسی طرح کم نہ تھے۔ قرآن مجید میں خدا کا ارشاد ہوتا ہے:

''جب ہوا آئی تو انہیں کھجور کے درخت کے تنے کی طرح جڑ سے اُکھاڑ کے زمین پر پٹخ دیتی تھی۔''

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ قوم عاد کے لوگوں کے اجسام کو اس لیے کھجور کے درخت سے مشابہت دی گئی ہے کیونکہ ہوا ان لوگوں کے سروں کو جسم سے الگ کر کے ان کے جسموں کو زمین پر گرا دیتی تھی اس طرح سر کٹے ہوئے جسم کو کھجور کے درخت سے جس کی شاخیں اور پتے الگ کر دیئے گئے ہوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

''مُّنقَعِرٍ'' کے معنی ہیں اُکھاڑ پھینکا ہوا۔ یہ شدید ہوا ان کی' ٹانگوں کو جنھیں وہ گارے اور ریت میں پیوست کر چکے تھے کھجور کے درخت کی مانند جس کی شاخیں اور پتے جدا ہو کر جڑ سے اُکھاڑ کر انہیں بلندی پر لے جا کر زمین پر پٹخ دیتی تھی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ قوم عاد کے لوگوں کے اجسام کو اس لیے کھجور کے درخت سے مشابہت دی گئی ہے کیونکہ ہوا ان لوگوں کے سروں کو جسم سے الگ کر کے ان کے جسموں کو زمین پر گرا دیتی تھی۔ اس طرح سر کٹے ہوئے جسم کو کھجور کے درخت سے جس کی شاخیں اور پتے الگ کر دیئے گئے ہوں سے تشبہہ دی جاتی ہے۔

جس کے نتیجہ میں ان کی گردنیں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی تھیں اسی بناء پر ان کے سر بھی جسموں سے جدا ہو گئے تھے جیسا کہ کھجور کا وہ درخت جس کے تنے پر کوئی شاخیں نہ ہوں اور بے سر ہو۔

حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے کچھ پیروکاروں نے ایک گڑھے کی مانند نشیبی مقام پر پناہ لے لی تھی۔ اور یہی باد صرصر جو قوم ہودؑ کیلئے پریشانیوں اور مشکلوں کا باعث بنی ہوئی تھی' ہود علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے لیے آرام دہ اور جسم کو تازگی بخشنے والی نسیم بن گئی تھی۔۔

خدا جہاں بھی چاہے جہنم بنا سکتا ہے۔

قوم ہود علیہ السلام کی ہلاکت کے بعد حضرت ہود علیہ السلام مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہو گئے اور حیاتِ عزیز کے آخری ایام تک وہیں پر رہائش اختیار فرمائی۔

ریت میں دفن ہو گئے

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہود علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کے بعد خدا نے حکم دیا کہ ریت کے ان ٹیلوں کو بدکردار اور بداعمال قوم ہود علیہ السلام کے اجسام پر قرار پائے۔ ایک اور روایت کے مطابق ان میں سے بعض افراد ریت کے ڈھیروں کے نیچے تڑپ تڑپ کے ہلاک ہو گئے۔ آج بھی اس ریت کے نشانات باقی ہیں' جہاں پر یہ قوم ہلاکت کا نشانہ بنی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ قوم عاد عمان سے لے کر حضرموت کے علاقے میں رہتے تھے۔

فَکَیۡفَ کَانَ عَذَابِیۡ وَ نُذُرِ.

''تو ان کو میرا عذاب اور ڈرانا کیسا تھا؟''

ہوا تو ہوا ہوتی ہے بس اشارے کی دیر ہوتی ہے اور جیسے اسے حکم دیا جائے وہی صورت و انداز اختیار کر لیتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب ہوا تیز چلتی تھی تو رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کا رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ اس لیے ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ عذاب ہم سے دور ہے کیونکہ انسان کو حالت خوف و رجاء پر باقی رہنا چاہیے۔

قوم عاد کو عرصہ دراز تک ڈرایا دھمکایا گیا تھا لیکن ان پر اس ڈرانے دھمکانے کا کوئی اثر نہ ہوا آخر کار ان پر عذاب نازل کیا گیا۔ ایسے حادثے کئی بار رونما ہوئے ہیں کہ کوئی عمارت اپنے مکینوں پر گر پڑی ہو جہاں مکینوں کو توبہ اور وصیت کرنے کا موقع بھی میسر نہ ہوا ہو' آپ بھی اپنے بارے میں فکر مند رہیے اور اپنی عمر کے اس قیمتی سرمایہ سے فائدہ اٹھایئے اور اس کی قدر کیجئے۔ اب جبکہ وقت اور موقع ہے اپنے گذشتہ برے اعمال سے تائب ہو جائیں۔

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ.

"اور ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے واسطے آسان کر دیا تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔"

یہاں پر اس آیۂ مبارکہ کو ایک بار پھر دہرایا گیا ہے بے شک خدا انتہائی رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے اسے بے حد پیار ہے۔ اسی لیے وہ بار بار زور دیتا ہے کہ اس کے بندے سیدھی راہ اختیار کریں اور نصیحت حاصل کریں۔ حضرت سید الساجدین علیہ السلام فرماتے ہیں "خدایا تو اپنے بندوں سے اتنا زیادہ پیار کرتا ہے اور ان سے التجاء کرتا ہے کہ وہ تیری طرف لوٹ آئیں

یوں محسوس ہوتا ہے جیسا کہ تیری ذات والا صفات ان کی محتاج ہے۔"

لہٰذا مفسرین فرماتے ہیں اس آیۂ مبارکہ میں بات کو دہرایا جا رہا ہے اور یاد کرایا جاتا رہے گا۔ "عذاب" مفرد ہے اور "نذر نذیر" کا صیغہ جمع ہے یعنی اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کئی بار ڈرایا لیکن عذاب ایک بار نازل فرمایا:

چنانچہ ہمیں کسی بھی حال میں قوم عاد کی داستاں نہیں بھلانی چاہیے۔ اس قوم کے لوگ آٹھ دن اور سات راتیں ریت میں دبے ایڑیاں رگڑتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے۔ ان کے جسموں پر اتنی زیادہ ریت اکٹھی ہو چکی تھی کہ ان کے جسم نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

قوم عاد کے اجسام کی پانچ ہزار سال بعد حالت

عرصہ پانچ ہزار سال کے گذرنے کے بعد مہدیؒ (عہد عباسی کا ایک خلیفہ) کے زمانے میں ایک کنواں کھودنے کا پروگرام بنایا گیا تاکہ پانی کا حصول ممکن ہو سکے۔ کنویں کی کھدائی کا کام شروع ہوا لیکن جتنی کھدائی ہوئی پانی نہ نکلا۔ مہدی غضب ناک ہوا اور کہنے لگا کہ اس قدر کھودا جائے کہ پانی نکل آئے چاہے اس پر سارا خزانہ خالی ہو جائے۔ اس طرح ایک خطیر رقم اس کام کے لیے خرچ کی گئی آخر کار ایک چٹان تک پہنچ گئے اور اس چٹان کو انتہائی دشواری کے ساتھ وہاں سے ہٹایا گیا، جس کے نتیجہ میں شدید ہوا چل پڑی۔ جو لوگ کنویں کی تہہ میں تھے انہوں نے مردہ اجسام کا ان کے برتنوں کے ہمراہ مشاہدہ کیا۔ ان کے جسم راکھ کی مانند خستہ ہو چکے تھے اور جونہی وہ لوگ ان کے جسموں کو ہاتھ لگاتے تھے وہ مٹی کی مانند بکھر جاتے تھے۔

اس معمہ کو حل کرنے کے لیے وہ غور وفکر کرنے پر مجبور ہو گئے اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؑ نے گریہ وزاری فرمائی اور ارشاد فرمایا یا یہ قوم عاد کی باقیات ہیں۔

یا ان لوگوں کی دنیاوی سزا تھی جبکہ آخرت میں ان پر ہونے والے عذاب کے بارے میں صرف اللہ ہی علم رکھتا ہے۔

علامہ مجلسی حیات القلوب میں بیان کرتے ہیں کہ معتبر اسناد کے مطابق علی بن یقطین سے منقول ہے کہ منصور دوانیقی نے علی بن یقطین کو حکم دیا کہ سر عبادی کے علاقے میں ایک کنواں کھودا جائے چنانچہ یقطین اس کنویں کی کھدائی میں مشغول ہو گیا۔ البتہ پانی کنویں سے نہ نکل سکا۔ جب یہ خبر مہدی کو دی گئی تو اس نے کہا کہ یہ کام ضرور کیا جائے گا یہاں تک کہ پانی ظاہر ہو جائے اور اگر بیت المال مکمل طور پر خالی بھی ہو جائے تو یہ کام ضرور کیا جائے گا۔ چنانچہ یقطین نے اپنے بھائی ابو موسی کو کنواں کھودنے کے لیے بھیجا اور اس طرح ابو موسی بھی کنویں کی کھدائی میں مصروف ہو گیا نتیجتاً ''زمین کی تہہ میں ایک سوراخ ظاہر ہوا جس سے شدید اور تیز ہوا نکل پڑی۔ کنویں کی کھدائی میں مصروف افراد کو خوف لاحق ہو گیا اور ابو موسی کو اس امر کے بارے میں مطلع کیا۔ ابو موسی کنویں کے قریب آئے مجھے کنویں میں داخل کرو اس کنویں کا قطر چالیس گز تھا۔ اس طرح اسے ایک محمل پر سوار کیا اور رسوں کے ذریعے اسے محمل سمیت کنویں کی تہ میں بھیجا: اس نے اس سوراخ سے ایک ہیبت ناک منظر کا مشاہدہ کیا اور سوارخ سے تیز ہوا کی آواز بھی سنی۔ لہٰذا اس سوراخ کو مزید بڑا کرنے کا حکم دیا گیا' دو آدمیوں کو محمل میں بٹھایا گیا اور کہا گیا کہ سوراخ کے اس طرف کے حالات سے ہمیں آگاہ کرتے رہنا۔ اس طرح محمل کو مضبوط رسیوں کے ساتھ باندھ کر سوراخ کی دوسری جانب داخل کیا گیا۔ محمل پر سوار

دو آدمی کچھ عرصہ کے لیے کنوئیں میں ہی انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد محمل کی رسیوں کو حرکت دی گئی اور اسے کنویں کے باہر لایا گیا۔ سوراخ میں جانے والے افراد نے بیان کیا کہ ہم نے وہاں پر عجیب و غریب اور ہولناک مناظر کا مشاہدہ کیا ہم نے مرد، عورتوں، برتن اور مال و متاع کا مشاہدہ کیا جو تمام کے تمام پتھر بن چکے تھے جبکہ مرد اور عورتیں اپنے اپنے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ بعض لوگ بیٹھے تھے اور بعض لوگ لیٹے ہوئے تھے جبکہ بعض تکیوں کے سہارے آرام کی حالت میں نظر آئے۔ جب ہم انہیں ہاتھ لگاتے تو ان کے لباس و پوشاک غبار کی طرح ہوا میں بکھر جاتے تھے جبکہ ان کے مکانات اس طرح باقی تھے۔ جب ابو موسی نے مہدی کو ان تمام حالات و واقعات سے باخبر کیا تو علماء اس خبر سے حیران و ششدر رہ گئے چنانچہ امام موسی کاظم علیہ السلام کو عراق آنے کے لیے پیغام روانہ کیا گیا۔ جب آپ سے ان تمام حالات کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے، گریہ فرمایا اور بتایا کہ یہ قوم عاد کی باقیات ہیں، خدا کا قہر و غضب ان پر نازل ہوا تھا، اور وہ اپنے مکانوں اور عمارتوں سمیت زمین میں دھنس گئے۔ یہ لوگ ''اصحاب احقاف'' ہیں۔ پوچھا گیا احقاف کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: احقاف ریت کو کہتے ہیں۔

قوم ثمودؑ کی داستان

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُر.

''قوم ثمودؑ نے ڈرانے والے (پیغمبروں) کو جھٹلایا۔''

یعنی اس قوم (قوم ثمود) نے تمام پیغمبروں کو منجملہ حضرت صالح علیہ السلام باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور قہر الٰہی سے ڈرایا' یا یہ کہ قوم صالح علیہ السلام نے اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کی نصیحتوں اور سبق آموز داستانوں کو جھٹلایا۔

پروردگار عالم نے قوم نوحؑ اور قوم عادؑ کی عبرتناک داستانیں ان کے اسباب اور حالات اور ان اقوم کی ہلاکت کی وجوہات بیان فرمانے کے بعد ایک تیسری داستان جو قوم ثمود کے بارے میں ان کے پیغمبر صالح کی جانب اشارہ فرمارہا ہے تاکہ مزید عبرت کے حصول کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

امت مرحومہ

گو کہ پیغمبر آخر الزمان خاتم انبیاء و مرسلین حضرت محمد مصطفیٰؐ کی امت کو

امت مرحومہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس امت پر رحم کیا گیا ہے کیونکہ یہ آخری امت ہے زمانہ کے حساب سے نیز یہ کہ جو سابقہ اقوام پر سختیاں اور تکالیف وارد ہوئیں ہیں وہ ان کے بارے میں واقف ہیں اور اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو ان جیسا نہ بنائیں۔ نیز یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قوم ثمود کو اصحاب حجر بھی کہا گیا ہے کیونکہ سورۂ مبارکہ حجر میں اس قوم کا اس نام سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

ثمود سام کے فرزند اور پیغمبر صالح علیہ السلام

ثمود عربوں کا ایک قبیلہ تھا جو حجاز و شام کے علاقوں میں رہائش پذیر تھے۔ اس قوم کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ثمود نامی شخص جو سام بن نوح علیہ السلام کے پوتوں میں سے منسوب تھا اور ان کے پوتوں میں اس کا شمار ہوتا ہے یہ لوگ اصحاب حجر کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ حجر کا علاقہ قوم ثمود کا محل سکونت تھا۔

خدا نے اس قوم کی ہدایت کے لیے صالح علیہ السلام نامی ایک پیغمبر کا (جو اس قوم کے ایک فرد تھے) انتخاب فرمایا۔ رسول اللہؐ سے منقول ایک روایت کے مطابق پروردگار عالم نے حضرت صالح علیہ السلام کو سولہ سال کی عمر مبارک میں اپنا پیغمبر منتخب فرمایا اور اسی روایت کی رو سے قوم صالح نے ستر بت اپنے لیے تراشے ہوئے تھے۔ جبکہ حضرت صالح علیہ السلام ان لوگوں کو ان بتوں کی پوجا پاٹ سے منع فرمایا کرتے تھے اور انہیں اچھے اعمال اور خدائے واحدہ لاشریک کی عبادت کی جانب راغب فرماتے تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام ایک سو بیس ۱۲۰ سال تک اس وحشی قوم کی

رہنمائی فرماتے رہے اور یہ قوم عاد کی مانند اس درجہ نخوت و غرور میں مبتلا تھی کہ حضرت صالح علیہ السلام سے کہا کرتے تھے کہ تم بھی ہماری طرح کے ایک انسان ہو لہٰذا ہم تمہاری پیروی کیوں کریں اور تمہاری دعوت کیوں قبول کریں؟ کیا تمہارے پاس بہت زیادہ مال و متاع ہے؟ یا تم اچھی شہرت کے حامل ہو۔ مجموعی طور پر اس بدعمل اور گمراہ قوم نے خدا کے رسول علیہ السلام پر جھوٹ کا بہتان باندھا۔

''نذر'' لفظ نذیر کا صیغہ جمع ہے اور اگر نذر کا مفہوم پیغمبر سمجھا جائے تو اس کا مطلب پیغمبران یعنی بہت سے پیغمبر یا کئی پیغمبر'' ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ قوم ثمود کے پیغمبر یعنی حضرت صالح علیہ السلام تو ایک ہی فرد تھے پھر کس وجہ سے ان کا ذکر جمع کے صیغہ میں کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک مرسل یا پیغمبر کا جھٹلانا درحقیقت تمام پیغمبروں کو جھٹلانے کے مترادف ہے کیونکہ تمام انبیاء و مرسلین کی دعوت توحید پر ایمان اور برائیوں سے کنارہ کشی پر مرکوز رہی ہے۔

اور اگر ''نذر'' لفظ ''انذار'' کا صیغہ جمع ہو تو اس کا مفہوم حضرت صالح علیہ السلام کی جانب سے ڈرانا دھمکانا جسے ان کی قوم جھٹلاتی رہی۔

فَقَالُوْا اَبَشَرً مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ.

''تو کہنے لگے پہلے ایک آدمی کی جو ہم میں سے ہو اس کی پیروی کریں تو ہم گمراہی اور دیوانگی اور آتش میں پڑ گئے۔''

حضرت صالح علیہ السلام فرماتے تھے اگر میری پیروی نہیں کرو گے تو عذاب کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ وہ جواب میں کہتے کہ اگر ہم تمہاری پیروی کریں گے تو ہم گمراہی اور آگ سے قرار پائیں گے۔

یہ نادان اور انجام سے بے خبر قوم صالح علیہ السلام پر تین اعتراض کر رہی

تھی۔ پہلا یہ کہ پیغمبر بشر نہیں ہونا چاہیے بلکہ فرشتہ ہو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ایک ایسا انسان جو بچپنے سے ہمارے ساتھ رہا ہو اسے خلعت پیغمبری کیونکر حاصل ہو؟ اور ان کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت صالح یک وتنہا تھے اور انہیں کوئی شہرت ومعرفت حاصل نہیں ہے۔

کیا انس بشر فرشتہ کو برداشت کرسکتا ہے؟

انجام سے بے خبر ان لوگوں کا جواب یہ تھا کہ اگر پیغمبر فرشتہ ہو انسان دہشت زدہ ہو جائے کیونکہ وہ اس کی جنس سے نہیں ہے۔ دعوت وتعلیم کے لئے پیغمبر اور قوم میں انست کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ جب انسان بشر ہو تو وہ فرشتوں سے کیونکر مانوس ہوسکتا ہے؟ یقیناً ایسا کرنا فطرت کے منافی اقدام ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ فرشتہ یہ بات ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ انسان بداعمالیوں اور برائیوں کے راستہ پر گامزن رہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلاً وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُوْنَ. (الانعام۔ ۹)

"حالانکہ ہم اگر فرشتہ کو نبی بناتے تو آخر اس کو بھی مرد کی صورت بناتے اور جو شبہات یہ لوگ کر رہے ہیں وہی شبہات گویا ہم خود ان پر اس وقت بھی اوڑھا دیے۔"

مزید برآں ملک دوسرے عالم کی مخلوق ہے اور انسان اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کو دیکھنے کے لیے برزخی اور ملکوتی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت ختمی مرتبتؐ جو عالم بشریت کے طاقتور ترین مقام پر فائز ہیں اور

بالاترین روحانی مدارج کے حامل ہیں آپ نے بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی شکل میں صرف دو بار مشاہدہ کیا تھا اور اس عظیم روحانی طاقت کے نظارے سے آپ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ چنانچہ عام حالات میں حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی حقیقی جسامت اور ہیبت سے کہیں چھوٹے اور خوبصورت ہو کر آپؐ کے سامنے ظاہر ہوا کرتے تھے۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا میں روح پھونکنے کی حالت کے بارے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا.

''''تو وہ اچھے خاصے آدمی کی صورت بن کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔''

غیب پر ایمان

ابھی تک دیئے گئے جوابات قطع نظر اگر یہ بات طے ہو جائے کہ پیغمبر کو ملائکہ میں سے ہونا چاہیے پس غیب پر ایمان کا کیا بنے گا جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر بھی فرشتہ ہے اور عالم غیب کی مخلوق ہے تو عالم غیب کا تو اسے مشاہدہ حاصل ہو گیا اور اس طرح ایمان بالغیب کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے کارآمد ہو گا جنھوں نے ایک لحاظ سے انہیں نہ دیکھا ہو۔

توبہ کا دروازہ موت کی آخری گھڑی تک کھلا ہے

رسول خداؐ سے ایک حدیث منقول ہے کہ توبہ آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹانے سے قبل کے لمحہ تک قابل قبول ہے "قبل ان یعاین" یعنی ملک الموت کو

دیکھنے سے قبل، لیکن جب اسے معلوم ہو جائے کہ اب اسے جانا ہی ہوگا اس لمحہ توبہ کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جیسا کہ فرعون نے پانی میں ڈوبتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس خدا پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے لیکن اس کے منہ پر تالے لگائے جا چکے تھے۔ اب کیا فائدہ ابھی چند لمحے پہلے بغاوت کی راہ اختیار کی ہوئی تھی اور فساد کرنے والوں کے گروہ میں شامل تھا۔

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ.

''کہنے لگا کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں میں بھی ان پر ایمان لاتا ہوں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں۔'' (سورہ یونس: ۹۰)

اب کیا فائدہ۔ ابھی تو کچھ لمحوں پہلے بغاوت اور کفر کا راستہ اختیار کئے ہوئے تھا اور فساد کرنے والوں میں شامل تھا۔

آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ.

''اب مرنے کے وقت ایمان لاتا ہے، حالانکہ تو اس سے پہلے نافرمانی کر چکا اور فسادیوں میں سے تھا۔'' (سورہ یونس: ۹۱)

ان سب باتوں سے قطع نظر اجمالی طور پر یہ بتاتے چلیں کہ جن لوگوں کے پاس کوئی بہانہ نہیں ہوتا اور بفرض محال اگر فرشتہ انسانوں کی راہنمائی کے لیے بھیجا جاتا اس صورت میں بھی وہ اس قسم کے اعتراض اور بہانے فرشتے کے سامنے بھی پیش کر دیتے۔

پیغمبر کو ہم لوگوں میں سے نہیں ہونا چاہیے

دوسرا اعتراض جو حضرت صالح ؑ کے خلاف کیا گیا وہ یہ تھا ''ابشر منا'' صالح تو ہم میں سے ہی ہے' اس نے بچپن سے ہمارے ساتھ پرورش پائی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم میں سے ہی ایک انسان اور ہمارے قبیلہ کا ایک فرد رسالت کے لیے منتخب کرلیا جائے؟ کیونکہ ہم اور صالح علیہ السلام ایک ہی جنس سے ہیں اور ایک قبیلے کے افراد ہیں۔ ہم یہ بات کس طرح قبول کریں کہ پیغمبر جن و بشر میں سے ہو چنانچہ پیغمبر کسی اور مقام سے آنا چاہیے۔

پیغمبر صاحب حیثیت بڑے مشہور قبیلے کا فرد نہیں ہے

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ صالح علیہ السلام یکہ وتنہا ہیں لہٰذا ہم ایسے شخص کے کیوں تابع ہوں۔ پیغمبر کے ساتھ کئی افراد اور بڑا خاندان ہونا چاہیے۔ یہ احمق اور نادان لوگ ایسے گمان کرتے تھے کہ پیغمبری بھی ظاہری مال و دولت اور جاہ وحشمت کا ہی نام ہے۔ وہ اس چیز سے بے خبر تھے کہ روحانیت اور معنویت کا اس قسم کی چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ جاہ وحشمت اور روحانیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

حضرت موسیٰؑ بن عمران گڈریے تھے' ان کے پاس بھیڑ بکریوں کو ہانکنے کے لیے ایک عصا' گڈریوں کا لباس اور نعلین تھے جب آپ کو فرعون کو دعوت دینے کے لیے جانے کا حکم ہوا تو آپؑ نے عرض کیا:

''پروردگار عالم! میں یکہ وتنہا اور گڈریے کی صورت میں فرعون سے ملاقات کے لیے کیونکر جاؤں گا؟ صدائے ربی آئی کہ اگر ہمارا یہ ارادہ بن جائے تو

ہم تمہیں اس قسم کی خلعتوں اور زینتوں سے آراستہ کر سکتے ہیں جو فرعون کے تمام گھرانوں میں موجود نہ ہوں لیکن آپ کو اسی حالت میں فرعون کے پاس جانا ہوگا کیونکہ تمہاری زینت تقویٰ ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی گڈریے کے حلیہ میں فرعون کے دربار میں تشریف لے گئے۔ اس کے بعد کے واقعات بھی آپ نے ضرور پڑھے یا سنے ہوں گے کہ آپ نے کس طرح فرعون کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا تھا۔

انبیاءؑ کی ظاہری قوت اور بندوں کے اختیارات

اگر یہ بات فرض کر لی جائے کہ پیغمبر کو ایک عظیم لشکر اور غیر معمولی طاقت کے ساتھ لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا جائے تو لوگوں کو طاقت کے زور پر خدا کے حضور جھکنا پڑے گا اور یہ امر لوگوں کے اختیارات کے منافی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں اگر خدا کی یہ مشیت ہوتی کہ انبیاء کو مال و جاہ اور طاقت کے ہمراہ مبعوث بہ رسالت فرماتا تو وہ اپنے انبیاء کو تمام کائنات کے گنجینوں اور دفینوں سے سرشار فرما دیتا تاکہ وہ لوگوں کو اپنی جانب دعوت دے سکتے۔ تمام درندوں اور شیروں کو نبیوں کے لیے مسخر فرما دیتا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ نبوت کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی اور ناپید ہو جاتی۔

خدانہ کرے کہ لوگوں کو نماز پڑھنے کے لیے مجبور کیا جائے اور وہ نماز کو جبراً ادا کریں۔ اگر اِجباری رکوع و سجود کی کوئی قیمت ہوتی تو چوپائے تو ہمیشہ حالتِ رکوع ہی میں رہتے ہیں اور رینگنے والے جانور تو ہر حالت میں سجدہ ریز رہتے ہیں اور اگر وہ یہ چاہتا کہ کسی مخلوق کو جبراً قیام پر مجبور کرے تو نباتات اور درخت ہمیشہ حالت

قیام پر ہی قائم رہتے ہیں۔

لیکن خدا کا ارادہ یہ ٹھہرا کہ انسان بااختیار ہو۔ وہ واجبات کو ترک کرنے یا چھوڑنے پر قادر ہے جبکہ اپنے ہی اختیار سے حالت قیام میں بارگاہ الٰہی میں اپنے گناہوں کے لیے مغفرت کا طالب ہوسکتا ہے اس طرح وہ اپنی قید خواہش کو توڑ کر اور اپنا گرم بستر چھوڑ کر سحری کے وقت بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو کر امید و رجاء کی حالت میں تضرع وزاری میں مصروف ہوسکتا ہے۔

تَتَجَا فِیُ جُنُوْبَهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا.

''رات کے وقت ان کے پہلو بستروں سے آشنا نہیں ہوتے اور عذاب کے خوف اور رحمت کی امید پر پروردگار کی عبادت کرتے ہیں۔''

الغرض جو اعتراض حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف کیا جاتا تھا یعنی آپ اکیلے ہیں یہ ایک غلطی اور شبہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ نبوت کے نظام اور دنیاوی حکومتوں کے نظاموں کو ایک ترازو میں ماپتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے اگر ہم اس کی باتوں میں آ جائیں تو ہم گمراہی اور دیوانگی کا شکار ہو جائیں گے۔

''سعر'' کے معنی جنون اور دیوانگی ہے۔ وہ لوگ حضرت صالح کی باتوں کو انہیں کی طرف لوٹا دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے اگر تم میری پیروی نہ کرو گے تو گمراہی کا شکار ہو جاؤ گے۔ وہ بھی کہتے تھے اگر ہم حضرت صالح کی پیروی کریں گے تو گمراہی اور دیوانگی کے شکار ہو جائیں گے۔

ءَ اُلْقِیَ الذِّکْرَ عَلَیْهِ مِنْ بَیْنِنَا.

''کیا ہم سب میں سے بس اسی پر وحی نازل ہوئی ہے۔''

''ذکر'' کے معنی ہیں ''یاد'' لیکن یہاں پر یہ لفظ وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس کے معنی ہیں آسمانی کتاب، وحی الٰہی اور رسالت کی تعلیمات اور احکام کے۔

قوم صالح کے لوگ کہتے تھے ہمارے درمیان ایسے افراد بھی ہیں کہ صالحؑ سے بالاتر حیثیت کے حامل ہیں کیا اسی پر ذکر نازل کیا گیا ہے؟

بَلْ ھُوَ کَذَّابٌ اَشِرٌ.

''بلکہ یہ تو بڑا جھوٹا تعلّی کرنے والا ہے''

اس مقام پر ان لوگوں نے دو عجیب و غریب تہمتیں پیغمبر پر لگائیں ایک یہ کہ انہوں نے کہا کہ صالح علیہ السلام جھوٹے ہیں جبکہ لوگوں کو توحید کی طرف دعوت دینے اور انہیں نیکی کی جانب راغب کرنے سے قبل صالح علیہ السلام کی نیکیوں اور سچائیوں کا اقرار کرتے رہے تھے، تاہم جونہی آپؑ نے ان لوگوں کو بت پرستی سے کنارہ کش ہونے اور خدائے واحد کی بندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تو وہ کہنے لگے کہ صالح علیہ السلام انتہائی جھوٹے ہیں ''نعوذ باللہ من ذالک'' یہ بعینہ وہی صورت ہے جیسا کہ ختمی مرتبتؐ مبعوث بہ رسالت ہونے سے پہلے صادق و امین کے لقب سے مشہور تھے۔ بعثت کے بعد جب آپؐ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ دشمن تمہارے گھر بار اور مال و متاع پر یلغار کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہے ہیں تو کیا میری بات کو قبول کرو گے؟ سب لوگوں نے بیک زبان ہو کر کہا:

''یا محمدؐ! ہم آپ کی تصدیق کریں گے کیونکہ آپؐ کا ہر عمل، قول اور فعل

سچائی اور صداقت کا نمونہ ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ابتداء میں ان سے اقرار لیا، بعد میں فرمایا میں تمہیں عذاب الٰہی سے خبردار کرتا ہوں کیونکہ تم مشرک ہو اس لئے کلمہ " لاالہ الا اللہ " (اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں) کا اقرار کرو تو فلاح پاؤ گے اور اپنی مراد حاصل کرو گے۔ اس موقع پر ابولہب نے آپؐ کو ہڈیوں اور پتھروں کا نشانہ بنایا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی آپؐ پر مختلف تہمتیں لگانے لگے، کسی نے آپؐ کو جادوگر کہا اور کسی نے آپؐ کو شاعر ٹھہرایا۔

خیر اب اپنے اصل موضوع کی جانب لوٹتے ہیں۔ قوم صالح علیہ السلام نے اپنے پیغمبر کے بارے میں کہا کہ یہ انتہائی جھوٹا ہے۔

دوسری تہمت جو ان لوگوں نے حضرت صالحؑ پر لگائی وہ خود خواہی اور تعلیٰ کی تھی وہ کہنے لگے کہ صالح علیہ السلام جاہ و جلال اور مقام و شہرت کے طلبگار ہیں وغیرہ، وغیرہ، حالانکہ انبیاء علیہم السلام نے دنیا میں ہمیشہ زہد کی راہ اختیار کی ہے اور مال و متاع سے کسی قسم کی رغبت نہ رکھی۔

نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے انبیاء و مرسلین علیہم الصلوۃ والسلام کے حالات کے بارے میں ایک خطبہ منقول ہے اس خطبہ میں آپؐ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اس قدر ریگستان کی سبزیاں تناول فرمائیں کہ آپ کے شکم مبارک کی کھال سے سبزی نمایاں طور پر نظر آنے لگی۔ حضرت عیسی علیہ السلام کھلے میدانوں اور صحراؤں میں زندگی بسر فرماتے تھے۔ آپؐ چاند کی روشنی سے چراغ کا کام لیتے تھے۔ آپؐ کے اہل وعیال نہ تھے۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ کی زندگی زہد وتقویٰ کا نمونہ تھی

رسول خداؐ ایک روز حضرت عائشہ کے کمرے میں داخل ہوئے وہاں ایک جاذب نظر پردہ آویزاں تھا آپ نے فرمایا:

کہ اس پردہ کو اتار دو کیونکہ یہ مجھے دنیا کی طرف راغب کرتا ہے۔

نیز حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول خداؐ نے کبھی سیر ہو کر کھانا تناول نہ فرمایا اینٹ پر اینٹ نہ رکھی۔ مکان نہیں بنایا حالانکہ اگر چاہتے تو سونے کا مکان تیار کر سکتے تھے۔ آپؐ کے بیت الشرف کی دیواریں کھجور کے درخت کی لکڑیوں سے تیار کی گئی تھیں اور اس کی چھت کھجور کے پتوں سے بنائی گئی تھی۔ حضور پاکؐ اپنے آپ کو معاشرے کے کمزور ترین افراد کے برابر سمجھتے تھے۔ اس طرح دیگر انبیاء و مرسلین علیہم الصلوۃ والسلام بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں ایسے ہی اوصاف کے حامل تھے۔ چنانچہ صالح علیہ السلام پر اس قسم کی صفات سے متصف ہوتے ہوئے جاہ طلبی کی تہمت لگائی جا رہی تھی۔

اپنے عیوب اور برائیاں دوسروں سے منسوب کرنا

اس بات کا آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ بعض فاسق و فاجر اور بدعمل لوگ اپنے اندر پائی جانے والی برائیوں اور برے افعال کو دوسروں سے نسبت دیتے ہیں۔ کیونکہ حضرت ثمودؑ کی قوم بذات خود بے انتہاء، خودخواہ، خودغرض، مغرور اور شہرت وعزت پسند تھی۔

اسی لئے اپنے ذاتی صفات کو حضرت صالح علیہ السلام سے نسبت دیتے تھے۔ چنانچہ اگلی آیہ مبارکہ میں خدا کا ارشاد ہوتا ہے:

سَیَعْلَمُوْنَ غَدًا مِنَ الْکَذَّابُ الْاَشِرُ.

''ان کوعنقریب کل ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون بڑا جھوٹا تکبر کرنے والا ہے۔''

''غداً'' کے معنی ہیں ''کل'' یہاں پر کل سے مراد یا تو عذاب کے نازل ہونے کا دن یا پھر اس سے مراد روز قیامت ہے۔

قوم ثمود سے کہا جا رہا ہے کہ اس وقت جو تہمت بھی لگانا چاہو لگا لو لیکن یہ جان لو کہ عنقریب میرے افعال و اعمال سے پردہ اٹھایا جائے گا اور تکبر کرنے والے اور جاہ و منصب کے طلبگار چیونٹیوں کی شکل میں انتہائی ذلت و خواری کے عالم میں محشور کئے جائیں گے۔

صالح علیہ السلام کی اونٹنی

اِنَّا مُرْسِلُوْا النَّاقَةَ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ.

''اے صالح ؑ! ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیجنے والے

ہیں، تو تم ان کو دیکھتے رہو اور (تھوڑا) صبر کرو۔''

علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں حضرت محمد مصطفیؐ سے ایک مستند روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام سو سال کی عمر تک اپنی قوم میں دعوت کا فریضہ انجام دیتے رہے، قوم ثمود نے آپ کے خلاف کئی تہمتیں لگائیں، بے شمار اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں اور ان سب بدسلوکیوں کے ساتھ ساتھ آپؑ کی دعوت اور رسالت کی کبھی تصدیق نہ کی۔ آخر کار آپ دل برداشتہ ہو گئے اور اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

کہ آؤ یہ کام کرتے ہیں کہ میں تمہارے بتوں سے کوئی حاجت طلب کرتا ہوں اگر میری حاجت روائی ہو گئی تو میں اپنی اس دعوت سے دست بردار ہو جاؤں گا اور تمہارا علاقہ چھوڑ دوں گا، لیکن اگر تمہارے بتوں نے میری حاجت پوری نہ کی تو تم مجھ سے کسی حاجت کی برآوری کے لیے کہنا، میں اس کو پورا کرنے کے لیے اپنے

خدا سے رجوع کروں گا اگر تمہاری حاجت کو میرے خدا نے پورا کر دکھایا تو تم بت پرستی سے کنارہ کش ہو جانا اس بات پر قوم ثمودؑ نے کہا:

''یہ تو منصفانہ فیصلہ ہے ہمیں تمہاری بات قبول ہے البتہ پہلے تم ہمارے بتوں سے کوئی حاجت طلب کرو۔''

چنانچہ اس کام کے لئے ایک عید کا دن مقرر کیا گیا۔ ثمود کی قوم نے اپنے تمام بتوں کو انتہائی تزک و احتشام اور احترام کے ساتھ اپنے کندھوں پر رکھا اور لے کر گھروں سے باہر نکل گئے۔ وہ صبح ہوتے ہی ریگستان میں کھلے آسمان کے نیچے بتوں کے سامنے رقص کرنے میں مصروف ہو گئے تا کہ اپنے بتوں کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ پھر دوپہر کے بعد انتہائی راز و نیاز کے بعد بتوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

اے ہمارے دیوتاؤ!

آج ہمیں تمہاری مدد کی سخت ضرورت آن پڑی ہے، صالحؑ جو حاجت تم سے طلب کرے وہ پوری کر دینا۔

صالح علیہ السلام بھی سب سے بڑے بت کے سامنے آئے اور اسے آواز دی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بعد ازاں آپؑ دوسرے بت کے پاس گئے اور اسے بھی آواز دی لیکن اس نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔

چنانچہ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بات کو سنتے تک نہیں۔ قوم ثمود کے لوگ اپنے بتوں کے قریب آئے اور انتہائی عاجزی کے ساتھ اپنی پیشانیوں اور چہروں کو خاک پر رگڑتے ہوئے دیوتاؤں سے مخاطب ہو کر کہا:

''ہمیں صالح علیہ السلام کے سامنے شرمسار نہ کرو۔ صالح علیہ السلام نے

ایک بار پھر ان کے بتوں کو صدا دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ تیسری بار قوم ثمود کے لوگوں نے اپنے دیوتاؤں کے سامنے بہت زیادہ گریہ وزاری کی لیکن بے سود۔ حضرت صالح علیہ السلام نے لوگوں کو بلند آواز سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''دن کا اختتام ہو چکا ہے لیکن تمہارا دعویٰ سچا ثابت نہیں ہوا اور بتوں نے آخر تک کوئی جواب نہیں دیا۔''

پھر حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

''اب تم لوگ جو حاجت رکھتے ہو مجھے اس سے آگاہ کرو تاکہ

میں اپنے خدا سے اس حاجت کو طلب کروں۔''

قوم ثمود نے اس کام کے لیے ستر ۷۰ آدمیوں کو منتخب کیا اور کہا کہ یہ ہمارے نمائندہ ہیں سو جو یہ چاہیں گے اگر آپ وہ پورا کر دکھائیں تو ہم آپ کی صداقت پر ایمان لے آئیں گے۔ صالح علیہ السلام نے ان لوگوں سے ایک بار پھر اقرار لیا کہ کیا ان کا مطالبہ تم سب لوگوں کا مطالبہ ہے؟ اور اگر یہ مطالبہ پورا ہو گیا تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ سب نے ایک آواز ہو کر اثبات میں جواب دیا۔ آپؑ نے ان لوگوں سے فرمایا:

''تمہاری کیا حاجت ہے؟''

انہوں نے باہمی مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ صالح علیہ السلام سے ایک ناممکن مطالبہ کیا جائے۔ لہٰذا قوم ثمود کے منتخب افراد اپنے پیغمبر کو ایک ایسے پہاڑ کے قریب لے آئے جس میں کوئی دراڑ بھی نہ تھی۔ وہ صالح علیہ السلام سے کہنے لگے کہ اپنے خدا سے کہو کہ یہ پہاڑ اونٹنی کا ایک بچہ پیدا کرے جو مادہ ہو' اس کے بال سرخ رنگ کے ہوں اور پیٹ میں دس مہینہ کا بچہ ہو۔ اور اس کے دونوں کانوں کا

درمیانی فاصلہ ایک میل کے برابر ہو۔ یہ نادان اور انجام سے بے خبر قوم یہ نہیں جانتی تھی کہ اس ذات کے لئے جو علی کل شیء قدیر ہے اس قسم کی مخلوق کو پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں بلکہ اس کی عظیم ذات کی عظمتوں کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ اس قادر مطلق کے لئے یہ بات کوئی معنی ہی نہیں رکھتی کہ پہاڑ اونٹنی کا بچہ جنے یا ایک اور پہاڑ کو پیدا کر دے۔ انسان کی پیدائش جو ایک نطفہ سے تشکیل پاتی ہے اور شکم مادر میں مختلف مراحل طے کرتے ہوئے ایک مکمل انسان کی شکل اختیار کر پاتی ہے کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ ''اَلْعَظَمَۃُ لِلّٰہِ'' بہر حال قدرت مطلقہ الٰہیہ کے لئے کسی بھی کام کا کرنا ناممکنات میں سے نہیں ہونا۔

پہاڑ سے اونٹنی کا بچہ پیدا ہونا

یکا یک پہاڑ سے چیخ کی آواز آئی، اس طرح جیسے کوئی حاملہ عورت دردزہ کی حالت میں چیخ رہی ہو۔ سب سے پہلے اونٹنی کا سر نمودار ہوا، پھر پوری اونٹنی نمودار ہوئی، وہ جگالی کر رہی تھی۔ جب اونٹنی کا مکمل جسم ظاہر ہوا تو قوم صالح کی جانب سے معین کردہ تمام کی تمام شرطیں اس میں موجود تھیں۔ لوگ حیران تھے اب انہوں نے صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اپنے خدا سے کہو کہ یہ فوراً بچہ جنے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کا یہ مطالبہ بھی قبول کیا اور خدا سے اس امر کے لیے التجا فرمائی۔ اونٹنی نے فی الفور بچہ جنم دیا۔ تب صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''اب تو میری رسالت کی تصدیق کرتے ہونا؟ وہاں پر موجود تمام افراد نے کہا:

آپ کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں اور معجزہ کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں۔ آپؑ نے ان ستر (۷۰) آدمیوں سے فرمایا کہ واپس لوٹ جاؤ اور اپنی قوم کے لوگوں کے سامنے یہ معجزہ بیان کرو تاکہ وہ بھی نبوت کی صداقت کا اقرار کریں ۔ ان ستر (۷۰) افراد میں سے چونسٹھ (۶۴) تو راستے میں اپنے وعدے سے پھر گئے اور کہنے لگے کہ یہ جادو ہے ۔لیکن باقی چھ آدمی اپنے ایمان اور وعدے پر قائم رہے۔

اِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةَ فِتْنَةً لَّهُمْ.

''اے صالح، ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیجنے والے ہیں۔''

''فِتْنَةً'' کے معنی ہیں آزمائش...... یہ عجیب وغریب آزمائش تھی ۔

''فَارْتَقِبْهُمْ'' تو تم ان کو دیکھتے رہو کہ یہ لوگ اس اونٹنی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ یہ اونٹنی جو خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، دیکھنا اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تمام مخلوقاتِ خدا کی نشانیاں اور آیات ہیں۔ لیکن یہ اونٹنی چونکہ معجزہ کے طور پر پیدا کی گئی تھی اس لیے یہ ایک خاص اور عجیب نشانی قرار دی گئی ہے۔

''وَاصْطَبِرْ'' اور کچھ دیر صبر کرو تاکہ (اے صالح) تمہیں معلوم ہو جائے کہ ان کے سینوں اور ذہنوں میں کیا کیا باتیں پوشیدہ ہیں۔

چشمے سے پانی لینے کی باری کا تعین

قوم ثمود کے یہاں ایک چشمہ تھا جہاں سے وہ دن کو پانی حاصل کرتے تھے۔ انہیں حکم ملا کہ ایک روز چشمہ سے تم لوگ پانی استعمال کرو گے اور دوسرا روز

اونٹنی کی سیرابی کے لیے مقرر تھا۔ اس دن اونٹنی چشمے کا تمام پانی پی کر ختم کر دیتی تھی اور اس کے بدلے قوم کے لوگوں کو اتنا دودھ دیتی تھی کہ قوم ثمود کا ہر فرد اس کے دودھ سے استفادہ کرتا۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ.

''اور ان کو خبر کر دو کہ ان کے درمیان پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے ہر ایک (باری والے) کو اپنی باری پر حاضر ہو نا چاہیے۔''

یعنی چشمے کا پانی ایک روز قوم ثمود کے لوگوں اور ان کے مویشیوں کے زیر استعمال رہتا تھا اور ایک روز یہ پانی صرف اونٹنی کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

''كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ'' یعنی باری باری گویا باری مقرر کر دی گئی تھی ''شرب'' کے معنی ہیں باری اور لفظ شرب کے بعد لفظ ''مُحْتَضَرٌ'' مقرر کر دینا ہے یعنی اونٹنی اور قوم کے لوگ اپنی اپنی باری پر چشمہ کے پانی سے فائدہ حاصل کریں۔

اب یہ معمول بن گیا تھا کہ ایک دن اونٹنی آ کر چشمے کا سارا پانی پیتی اور سیراب ہو کر چلی جاتی۔ وہ اس کے بدلے میں پوری قوم کی دودھ کی ضرورت پوری کرتی تھی۔ اور دوسرے روز قوم ثمود کے لوگ پانی سے فائدہ حاصل کرتے۔ یہاں تک کہ اس قوم کے بعض لوگ کہنے لگے، کہ یہ اونٹنی ہمارے چشمے کا تمام پانی کیوں پی جاتی ہے؟ روایات کے مطابق اس اعتراض کے جواز میں ایک وجہ یہ بیان کی گئی کہ جس روز اونٹنی کی پانی پینے کی باری نہیں ہوتی تھی اس روز بھی اونٹنی اسی مقام پر قیام کرتی ہے اور کسی بھی مویشی یا بھیڑ بکریوں کے مالک کو اس اونٹنی کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

اس قوم میں ''قدار'' نامی ایک شخص تھا' جو حد درجہ شقی القلب اور سفاک تھا اس کی شقاوت قلبی پوری قوم میں مشہور تھی۔ نیز یہ شخص بے باک' زنا کار اور ولد الزنا تھا۔ اس شخص کا تمام جسم سرخ رنگ کے بالوں سے بھرا ہوا تھا اس لئے وہ "احیمر" کے نام سے قوم میں مشہور تھا۔ قوم کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اونٹنی کو مارنے کی ذمہ داری قدار کو سونپی جائے اور ''مصدع'' نامی ایک شخص کو اس کا مددگار بنایا جائے اس طرح اونٹنی کو مارنے کی سازش تیار کی گئی۔

اونٹنی کو مارنے کی سازش

قوم صالح نے اونٹنی کو مارنے کے سلسلے میں ''صدوقہ اور عنیزہ'' نامی دو عورتوں کو اکسایا اور ترغیب دی کہ اونٹنی کو مارنے کی تجویز مصدع اور قدار ان کو پیش کریں۔ اور اونٹنی کو مارنے کی سازش کے مطابق عمل کرنے کی صورت میں وہ ان سے بیاہ رچانے کے لئے تیار ہیں۔

چنانچہ جب قدار اور مصدع ان دو عورتوں کے پاس آئے تو ان دونوں عورتوں نے غمگینی کا اظہار کیا' جس پر ان بدنصیب اور کم بخت عاشقوں نے سوال کیا کہ آپ افسردہ اور اندوہناک ہیں؟ دونوں عورتوں نے کہا کہ یہ اونٹنی ہمارے لیے دشواریاں پیدا کر رہی ہے' اگر تم دونوں مل کر اسے مار ڈالو تو ہم تمہارے ساتھ شادی کر لیں گی۔

اونٹنی کو ہرگز اذیت نہ پہنچانا

حضرت صالح علیہ السلام مختلف مواقع پر اپنی قوم کو اس سلسلے میں تاکید کر چکے تھے کہ اس اونٹنی کو گزند نہ پہنچانا۔ چنانچہ قرآن مجید کے سورۂ مبارکہ اعراف میں

ایک مقام پر ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. (الاعراف. ۷۳)

"یہ خدا کی (بھیجی ہوئی) اونٹنی تمہارے واسطے ایک معجزہ ہے تو تم لوگ اس کو چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرتی پھرے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تم دردناک عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ (الاعراف۔۷۳)

چنانچہ ان تمام تر فوائد کو جو اس اونٹنی سے حاصل کرتے تھے اور حضرت صالح علیہ السلام کی تمام سفارشوں اور نصیحتوں کے باوجود قوم کے لوگوں کو اُکسانے اور دو بدچلن عورتوں کی تجویز کے نتیجہ میں اس اونٹنی کو مارنے کی سازش تیار کی گئی۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ.

"تو ان لوگوں نے اپنے رفیق قدار کو بلایا' اس نے پکڑ کر اونٹنی کی کوچیں کاٹ ڈالیں۔"

"فَتَعَاطٰى" یعنی تلوار کو ہاتھ میں لیا (تھاما) بعض مفسروں کے نزدیک اس کے معنی ہمت کے ہیں کیونکہ تعاطی کا مفہوم اخذ الشیء با لتکلف یعنی کسی چیز کو ہمت اور جسارت کر کے لینا" اور یقیناً ایسے کام کے لیے جرأت وہمت اور جسارت کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر کوئی نطفۂ حرام نہ ہو تو وہ ایسا کام کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

بعض مفسروں کا بیان ہے کہ مصدع نے دور سے تیر چلایا جو اونٹنی کی دونوں ٹانگوں میں پیوست ہو گیا پھر قدار کو آواز دی کہ جاؤ اسے مار ڈالو چنانچہ قدار

نے تلوار سے اسے مار دیا۔

"فعقر" چنانچہ اونٹنی کی کوچیں کاٹ ڈالیں۔اونٹنی کی کوچیں پہلے وار میں تو نہ کٹیں البتہ دوسرے وار میں کٹ گئیں' اور جونہی اونٹنی زمین پر گری اونٹنی کا بچہ خوف سے بھاگ نکلا اور جس پہاڑی سے اس کی ماں باہر آئی تھی اسی پہاڑی کی جانب دوڑا اور پہاڑی کی چوٹی پر جا کر تین چیخیں ماریں اور روپوش ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد قوم ثمود نے ایک دوسرے کو خبر دی۔ چنانچہ حریص اور لالچی لوگوں نے اونٹنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور قوم کے ہر شخص نے اس کا گوشت کھایا۔

صالح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ

قوم ثمود نے اسی کام پر اکتفانہ کیا بلکہ انہوں نے قدار' مصدع اور سات دیگر افراد کو حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ سونپا۔ ثمودؑ کے لوگ کہتے تھے کہ اگر صالحؑ کی یہ بات سچی ہے کہ اونٹنی کے قتل کی صورت میں عذاب الٰہی نازل ہوگا تو بہتر ہے کہ انہیں پہلے ہی قتل کر ڈالیں اور اگر ان کا دعویٰ جھوٹا ہے تب بھی ہمیں اس سے جلدی نجات حاصل ہو جائے گی۔

صالح علیہ السلام رات کے وقت عبادت الٰہی میں مصروف تھے کہ مذکورہ نو (۹) آدمیوں نے ننگی تلواروں کے ساتھ آپؑ پر دھاوا بول دیا۔ ادھر فرشتوں کو حکم ملا کہ ان حملہ آوروں پر پتھراؤ کیا جائے۔ چنانچہ فرشتوں نے حکم ملتے ہی ان سب کو جہنم واصل کر دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کو وحی کے ذریعے خبر دی گئی کہ ثمود کی قوم نے اونٹنی کو قتل کر دیا ہے۔ صالح یہ سن کر غمگین ہوئے اور اس حادثہ سے آپ کو شدید تکلیف پہنچی۔ کیونکہ لوگوں نے خدا کے حکم کے منافی عمل کیا تھا۔ آپؑ نے اپنی قوم کو

انتہائی کرب و بے چینی کے عالم میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''تم نے ایسا کیوں کیا' میں نے تم لوگوں سے کہا نہیں تھا کہ اونٹنی کو تنگ نہ کرنا اور اسے اذیت نہ دینا؟؟ اور اگر ایسا کیا تو تم پر عذاب الٰہی نازل ہوگا۔

تین دن کی مہلت

صالح علیہ السلام کو خدا کی جانب سے حکم ملا کہ اپنی قوم کو آگاہ فرمائیں کہ اگر وہ اپنے اس فعل قبیح سے تائب ہو جاتے ہیں تو خدا تمہاری توبہ کو قبول کرتے ہوئے عفو و درگذر فرمائے گا اور تم لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرے گا۔ اس سلسلے میں تمہیں تین دن کی مہلت دی جاتی ہے تاکہ اپنے انجام کے بارے میں غور و فکر کرو' اور اگر تم نے خدا کے حضور توبہ نہ کی تو قہر الٰہی تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اس طرح آپؑ نے قومِ ثمود کو عذاب الٰہی کی تین نشانیوں کے بارے میں آگاہ فرمایا' کہ پہلے روز تم لوگوں کے چہروں کا رنگ زرد ہو جائے گا' دوسرے دن سرخ ہوگا اور تیسرے دن سیاہ ہو جائے گا۔ اور پھر تم پر غضب و قہر الٰہی نازل ہوگا۔ اگلے روز جب قوم ثمود کے لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کے چہرے زرد ہو گئے ہیں چنانچہ قوم کے بزرگ ان تمام افراد کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے ؟یوں معلوم ہوتا ہے کہ صالح علیہ السلام کی باتوں کی صداقت ثابت ہو رہی ہے ایسا نہ ہو کہ یہ عذاب الٰہی کا پیش خیمہ ہو۔ (بدبخت) بزرگ افراد نے کہا کہ ہمیں صالح علیہ السلام اور ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں۔

دوسرے دن قوم صالحؑ کے چہروں کے رنگ سرخ اور تیسرے دن تارکول

کی طرح سیاہ ہو گئے۔

پروردگار عالم نے ان لوگوں پر کس قدر رحمت واحسان فرمایا اور انہیں اتنے دن مہلت دی، لیکن وہ کمبخت اور انجام سے بے خبر لوگ تھے کہ جو موت کے منہ میں بھی چلے جائیں تو ایک لمحہ کے لیے بھی خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان نہیں لاتے۔

آج کل کے زمانے میں بھی ہمیں ایسے بہت سے افراد ملیں گے جنہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ لہو ولعب اور لغو باتوں میں گذار دیا ہوگا۔ ان کے سروں کے بال سفید ہو چکے ہوں گے، ان کے جسمانی قویٰ مضمحل ہو چکے ہوں گے، اور موت کے آثار ان پر نمایاں ہو گئے ہوں گے، لیکن انہوں نے آخرت کی کوئی فکر نہ کی ہوگی۔

قوم ثمود نے باوجود اس کے کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ عذاب الٰہی سے بچنے کی اب کوئی راہ باقی نہیں، پھر بھی خدا کے حضور اپنی بداعمالیوں سے توبہ نہ کی۔

موت طاری کرنے والی چنگھاڑ

اِنَّا اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ صَیۡحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوۡا كَهَشِیۡمِ الۡمُحۡتَظِرِ.

''ہم نے ان پر ایک سخت چنگھاڑ (کا عذاب) بھیج دیا تو باڑے کے سوکھے ہوئے چور چور بھوسے کی طرح ہو گئے''

ایک روایت میں منقول ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اتنی شدت سے چنگھاڑے کہ قوم صالح کے لوگوں کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور ان کے دل وجگر پارہ پارہ ہو گئے۔

اس چنگھاڑ کے بعد کیا ہوا؟ آسمان سے بجلی گری اور ان لوگوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

"هَشِيمِ" اسم مفعول ہے' اور اس گھاس پھوس کو کہتے ہیں جسے اکھاڑ کر ایک باڑے میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد سڑ جاتی ہے اور سوکھ کر چور چور ہو جاتی ہے۔ یہ گھاس پھوس موسم سرما میں جانوروں وغیرہ کے لیے محفوظ کر لی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا بیان قوم ثمود کی سبکی اور خفت کو ظاہر کرتا ہے یعنی وہ قوم اس قدر بے اہمیت اور بے کار گردانی گئی کہ انہیں بھوسے کی مانند قرار دیا گیا۔ باالفاظ دیگر درختوں کے خشک پتوں کی مانند ہو گئے جو ہوا کے ذریعے ادھر ادھر بھٹک رہے ہوتے ہیں اور لوگوں کے پیروں تلے روندے جاتے ہیں۔

بے شک جو خدا سے روگردانی اختیار کرتا ہے وہ انتہائی پست اور ذلیل ہوتا ہے' اس کی پستی اور ذلت جانوروں اور چوپاؤں سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے بلکہ وہ خاک سے بھی پست تر ہو جاتا ہے اور خود بخود اس طرح سوچتا ہے:

وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يَالَيْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا.

"اور کافر کہے گا کہ کاش میں خاک ہو جاتا" (النبا: ۴۰)

اس کے برعکس وہ شخص سرخرو ہوتا ہے جو اپنی زندگی کو خدا کی راہ میں اور خدا کی خاطر گذارتا ہے اور یقیناً عزت و سرفرازی ایسے ہی افراد کے لیے قرار دی گئی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ.

"حالانکہ عزت تو خاص خدا اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے۔"

اونٹنی کا قاتل کون؟

کیا اونٹنی کو پوری قوم ثمود نے قتل کیا یا صرف ایک شخص نے؟

مذکورہ آیات مبارکہ میں اونٹنی کے قتل کے سلسلے میں صرف ایک شخص کو ملزم ٹھہرایا گیا ہے "فَتَعَاطِیٰ فَعَقَرَ" یعنی صرف قدار نے اونٹنی کو مار ڈالا لیکن سورۂ مبارکہ والشمس میں ارشاد ہوتا ہے:

فَکَذَّبُوْہُ فَعَقَرُوْھَا.

"مگر ان لوگوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اسکی (اونٹنی کی) کو کاٹ ڈالا۔"

نیز یہ کہ یہاں پر یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اونٹنی کو مارنے والا ایک ہی شخص تھا تو پوری قوم پر کیونکر عذاب نازل کیا گیا؟

مذکورہ بالا دو سوالوں کا جواب حضرت علی علیہ السلام کے بیانات سے واضح ہو جاتا ہے۔ تفسیر برھان میں نیز نہج البلاغہ میں سید رضی سے حضرت علی علیہ السلام کے خطبات کے ضمن میں منقول ہے کہ:

اصبغ بن نباتہ نے ایک روز حضرت علی علیہ السلام سے یہ سوال کیا کہ آپؑ

ایک دن منبر پر تشریف فرما تھے اور آپ نے فرمایا تھا کہ اپنی تعداد کی کمی اور دشمنوں (کفار و فاسقین) کی مقدار کی کثرت سے خائف نہ ہوں۔

بعد میں آپ نے فرمایا:

کہ یہ لوگ ایک ایسے دسترخوان پر اکٹھے ہوئے ہیں جس سے وہ سیر نہ ہوں گے بلکہ ان کی بھوک میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

اِجْتَمَعُوا عَلٰی مَائِدَةٍ شَبْعُهَا قَلِیْلٌ وَجُوعُهَا کَثِیْرٌ.

یعنی ''یہ تمام لوگ دنیاوی مال وشہرت کے حصول کے درپے ہیں اور اس امر سے کبھی سیری حاصل نہیں ہوتی۔''

اس خطبہ کے تیسرے حصہ میں آپؑ فرماتے ہیں:

مخلوق میں تمام تر اختلافات کے باوجود ایک پہلو سے وحدت و یگانگت پائی جاتی ہے۔ حضرت آدم ابوالبشر سے لے کر روز قیامت تک ان کے درمیان ایک عظیم رسی کا وجود ہے جو تمام افراد کو اختلاف کے باوجود تسبیح میں پروئے ہوئے دانوں کی مانند ایک دوسرے سے منسلک رکھتا ہے' وہ رسی بھلا کیا ہوسکتی ہے؟

وہ رضا وغضب پر جمع ہونا ہے آپؑ فرماتے ہیں:

اِنَّمَا جَمَعَ النَّاسَ الرِّضَا وَالْغَضَبُ.

''بے شک لوگ رضا وغضب پر یک جا ہو گئے ہیں۔''

اگر کوئی شخص کسی کام کو پسند کرتا ہے اور اس کام کو بجالانے کی خواہش بھی رکھتا ہے لیکن اس کام کو کرنے کے لیے وسائل نہیں رکھتا تو اس کام کی خوبیوں کا ثواب اس شخص کے نامہ اعمال میں درج کرلیا جاتا ہے۔

دراصل جو شخص رسول خداؐ اور حضرت علی علیہ السلام اور حضرت سید الشهدا

امام حسین علیہ السلام کے ہمراہ جہاد کرنے والوں اور بعد میں شفاعت پر فائز ہونے والوں کے اقدام سے دلی طور پر راضی ہے اور ان کے اس عمل کے بارے میں موافق نگاہ رکھتا ہے (یہاں پر رضا اور رغبت سنجیدہ ہونا مشروط ہے' نہ کہ وقتی جذبات) تو اسے بھی اس عمل کا اتنا ہی ثواب حاصل ہوگا جتنا ان حضرات کو حاصل ہوا تھا۔

يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَكُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزاً عَظِيْماً.

''کاش میں بھی آپ کے ہمراہ ہوتا تو مجھے بھی فوز عظیم (عظیم کامیابی) نصیب ہوتی۔''

یعنی وہ قلباً شہادت کا طالب ہو اور شہادت اس کی مقصود و مطلوب ہو تو اسے بھی اس کا ثواب اتنا ہی حاصل ہوگا جتنا کہ رسول خدا' حضرت علی اور امام حسین علیھم الصلوۃ والسلام کے ہمراہ جہاد کرنے والوں کو شہادت کا ثواب ملے گا۔

اونٹنی کو قتل کرنے کے بارے تمام قوم رضا مند تھی

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ایک شخص نے قتل کیا لیکن خدا نے پوری قوم ثمود کو اپنے عذاب کا نشانہ بنایا اور انہیں ہلاک کر دیا۔

اِنَّمَا جَمَعَهُمُ الرَّضَا: یعنی پوری قوم ثمود اس فعل پر راضی تھی اور ان کی رضا مندی کی دلیل یہ تھی کہ جونہی انہیں اونٹنی کے مارے جانے کی خبر ملی تو ان میں سے ہر فرد نے آ کر اس کے گوشت میں سے اپنا حصہ حاصل کیا اور کھایا لہٰذا اگر وہ اس فعل قبیح پر راضی نہ تھے تو کیونکر اس کا گوشت کھایا اور اگر سب اس عمل پر رضا مند نہ ہوتے تو اس کا اظہار یوں بھی کر سکتے تھے کہ اس کے گوشت کو کھانے سے

گریز کرتے۔ اس طرح وہ یہ ثابت کر سکتے تھے کہ وہ اونٹنی کے قتل کے مخالف تھے۔ چنانچہ اس عمل کے بارے میں دلی طور پر ان کی رضا مندی اس فعل قبیح میں شرکت کے مترادف قرار دی گئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے یہ دریافت کیا جائے کہ علیؑ کا قاتل کون تھا اور جواب میں وہ شخص یہ کہے کہ وہ صاحب ایمان تھا تو اس کا میرے قاتلوں میں شمار ہوگا۔

کیا قلبی انکار یا عدم رضا مندی مشروط ہے

اسی طرح غضب، رضا و خوشنودی کے برعکس تفرقہ کو ہوا دیتا ہے۔ نہی عن المنکر یعنی برائیوں کو روکنا اہم ترین فرائض میں سے ایک ہے اور اس کے بھی درجات ہیں۔ برائیوں سے روکنے کا پہلا درجہ ہر قسم کے حالات میں تمام لوگوں پر ہر جگہ اور ہر مقام پر فرض ہے۔ نہی عن المنکر کا پہلا درجہ انکار قلبی یا دل میں کسی برے فعل سے راضی نہ ہونا ہے یعنی کسی برے کام کے سلسلے میں مسلمان کو دل ہی دل میں غم و غصہ ہونا چاہیے بہ الفاظ دیگر مسلمان محرمات سے دل میں نفرت کرتا ہو۔

چنانچہ جب ان باتوں کو مدنظر رکھیں گے تو ہمیں یہ آگاہی حاصل ہوگی کہ کون سے فرائض کی بجاآوری میں ہم غافل رہے ہیں۔ اگر ادا نہ کئے گئے فرائض کے بارے میں ہمیں کوئی دکھ نہیں پہنچا تو نہ صرف ہم نے ان فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کی بلکہ اس برے فعل کے برے اثرات ''نہی عن المنکر'' پر کار بند نہ ہونے کی وجہ سے ہم پر بھی مرتب ہوں گے۔ بلکہ بسااوقات غفلت کرنے والے بھی عذاب کے مستحق بھی ٹھہریں گے۔

لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اونٹنی کو قتل کرنے والا ایک ہی شخص تھا

تاہم قوم ثمود کے باقی افراد بھی اس کے اسی فعل پر رضا مند ہونے کے باعث اس کے جرم میں برابر کے شریک ہیں اور اس طرح وہ بھی اونٹنی کے قاتل ٹھہرتے ہیں اور سزا کے مستحق ہیں۔

اسی بناء پر سورہٴ مبارکہ والشمس میں پوری کی پوری قوم اونٹنی کی قاتل ٹھہرائی گئی۔

جو لوگ اونٹنی کے قتل پر رضا مند تھے وہ انتقام کا نشانہ بنے

امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ارواحنا لہ الفداء جب ظہور فرمائیں گے تو ان لوگوں سے جو حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے خون ناحق کو بہانے کے بارے میں رضا مند تھے انتقام لیں گے اور اس بات سے دعائے ندبہ کی مندرجہ ذیل عبارت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

اَینَ الطَّالِبَ بِدَمِ الْمَقْتُوْلِ بِكَرْبَلاَ.

''وہ بزرگوار ہستی کہاں ہے جو کربلا میں قتل کئے جانے والی ہستی کے بہانے جانے والے خون ناحق کا مطالبہ فرمائے گی۔''

قوم لوطؑ

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ.

"لوط کی قوم نے بھی ڈرانے والے (پیغمبروں) کو جھٹلایا"

پروردگار عالم نوح علیہ السلام اور قوم عاد وثمود کی داستانیں اور ان کی ہلاکت کے اسباب اور کیفیت بیان کرنے کے بعد اپنے بندوں کی مزید عبرت کے لئے قوم لوط کی داستان کا تذکرہ فرماتا ہے۔

یہ قوم مؤتفکات نامی علاقے میں رہائش پذیر تھی جو پانچ یا سات بستیوں پر مشتمل تھا۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام بستیوں کی مجموعی آبادی چار لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام عرصہ تیس سال تک اس قوم کی تبلیغ میں مصروف رہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے یہ فریضہ انہیں سونپا گیا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام اس پوری مدت میں اپنی قوم کو خدا کے قہر وغضب سے ڈراتے رہے۔

لوط علیہ السلام اپنی قوم کو نصیحت فرماتے رہے کہ:

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ

قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ. (الاعراف . ۸۱)

''تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت پرستی میں مردوں کی طرف مائل ہوتے ہو حالانکہ اس کی ضرورت نہیں، مگر تم لوگ ہو ہی بے ہودہ اسراف کرنے والے (کہ نطفہ کو ضائع کرتے ہو)''

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ. (النمل . ۵۵)

''کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت کے لئے مردوں کے پاس آتے ہو، یہ تم اچھا نہیں کرتے بلکہ تم بڑی جاہل قوم ہو۔''

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِيْنَ٥ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ.

(الشعراء۔ ۱۶۵، ۱۶۶)

''کیا تم لوگ شہوت پرستی کے لئے سارے جہاں کے لوگوں میں مردوں ہی کے پاس جاتے ہو اور تمہارے واسطے جو بیبیاں تمہارے پروردگار نے پیدا کی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو (یہی کچھ نہیں) بلکہ تم لوگ حد سے گزر جانے والے آدمی ہو۔''

نطفہ کو ضائع کرنا اسراف ہے

لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ہو ہی بیہودہ اسراف کرنے والی قوم۔ اولاً: اس بات سے بڑھ کر کیا اسراف ممکن ہے کہ وہ نطفہ جو ایک بیج کی مثال ہے اور جو رحم مادر میں قرار پا کر انسانی تخلیق کا باعث بنتا ہے اسے تم لوگ اس

طریقے سے بے ہودہ مقام پر صرف کر کے جو اس کا فطری مقام ہے وہ ضائع کر دیتے ہو۔

اے میری قوم تم کیوں انسانی طاقت کے غیرت و ناموس کو جو نوع انسان کی بقائے نسل کا موجب ہے اور ازدواجی زندگی' محبت اور جوش و خروش کا سبب بنتا ہے اسے بے ہودہ طریقے سے صرف کر کے ضائع کرتے ہو۔ یہ راستہ بالکل غلط ہے۔ اس طریقے سے تم نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ اپنی بیویوں پر بھی ظلم کرتے ہو۔

لیکن اس بے غیرت و بے حمیت قوم پر لوط علیہ السلام کے وعظ و نصیحت کا ذرا برابر اثر مرتب نہ ہوا اور وہ اپنے ان اعمال قبیحہ پر جو بجائے خود ایک گناہ کبیرہ ہے اور جس کی سزا زنا سے کہیں زیادہ مقرر ہے' کاربند رہے' آخر کار ان کی بد اعمالیاں اپنی حدوں کو پار کر گئیں اور وہ اس برے فعل کو ایک دوسرے کے سامنے سرعام انجام دینے لگے۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ حَاصِبًا.

"تو ہم نے ان پر کنکر بھری ہوا چلائی۔"

حَصَبُ: وہ سنگریزے ہیں جو ہاتھ کی ہتھیلی سے چھوٹے ہوتے ہیں اور حَاصِبُ: ان سنگریزوں کو برسانے والا ہوتا ہے اور آیہ مبارکہ میں یہ حذف شدہ موصوف کی صفت ہے جو ریحاً: ہے چنانچہ اس آیہ مبارکہ کا معنی یہ ہوا۔

"بہ تحقیق ہم نے ان پر کنکر بھری ہوا چلائی' جو چھوٹے چھوٹے کنکروں کو اوپر کی جانب سے ان پر برسا رہی تھی۔"

قوم لوط علیہ السلام پر پتھروں کی بارش

جس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ان سات بستیوں یا شہروں کو بلند فرما کر آسمان تک لے گئے ۔ تو جیسے مرغ اور دیگر جانوروں کی آوازیں آسمانوں میں یا فضا میں بلند ہوتی ہیں، اسی طرح اس قوم کے لوگوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ چنانچہ اس مقام پر ایک شدید ہوا چل پڑی اور ان پر مذکورہ سنگریزوں اور پتھروں کی بارش کی گئی۔ ان پتھروں کی زد سے اس قوم کا ایک فرد بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ ہم یہاں یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ جس شخص کا عمل بھی قوم لوطؑ کے عمل کے مانند ہوگا، موت کی گھڑی میں وہ انہیں پتھروں اور سنگریزوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ کیونکہ آیہ مبارکہ کی تفسیر کے ضمن میں بیان ہوا ہے:

وَمَاهِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ.

''اور ظالموں کا بھی یہی حال ہوگا''

تاہم وہ رسوائی سے بچ جائے گا کیونکہ یہ منظر دوسرے لوگ نہیں دیکھ رہے ہونگے بلکہ صرف مرنے والے شخص ہی کو نظر آرہا ہوگا۔ یہ بھی پروردگار عالم کی رحمت ہے اور اس کا لطف و کرم ہے کہ جب تک اس دنیا میں موجود ہوگا اس کی رسوائی دوسروں کے سامنے نہ ہوگی۔ بہرحال یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل قبیح کے لئے یہ ایک خاص عذاب ہے۔

شہروں پر پتھر کی بارش کے بعد:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (ھود ۔ ۸۲)

''پھر جب پہنچا ہمارا حکم تو ہم نے اس بستی زمین کے طبقے الٹ

کر اس کے اوپر کے حصے کو اس کے نیچے کا حصہ بنا دیا۔"

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے تمام شہروں کو آسمان کی بلندی سے زمین پر الٹا کر پٹخ دیا۔"

اِلَّا اٰلَ لُوۡطٍ نَجَّیۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ.

"مگر لوط کی آل کو ہم نے پچھلی رات ہی کو بچا لیا"

ہم نے یہ عذاب نازل کیا اور سب کو ہلاک کر دیا مگر لوط علیہ السلام کے گھر والے" (ہر شخص کی آل میں وہ افراد شامل ہوتے ہیں۔ جن کی اس شخص پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے) لہٰذا اس امر پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ آل لوطؑ میں ان کی تین بیٹیاں شامل ہیں چونکہ آپ کی زوجہ کی ذمہ داری آپ پر نہ تھی اور وہ کافرہ تھی اس لئے اس کا آل لوطؑ میں شمار نہیں ہوتا۔ بعض مفسرین کے مطابق آپ کے داماد اور چند پیروکار جن کی تعداد تیرہ افراد تھی کو بھی نجات پانے والوں میں شمار کرتے ہیں۔

نَجَّیۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ: ان لوگوں کو پچھلی رات کو نجات دے دی گئی تھی۔ یعنی طلوعِ فجر سے قبل اور عذاب نازل ہونے کے وقت انہیں نجات ملی تھی۔ چنانچہ ہم نے لوط علیہ السلام اور ان کی تین بیٹیوں کو ان بستیوں یا شہروں کی حدود سے باہر روانہ ہونے کا حکم دے دیا تھا (رات کے تیسرے پہر کو اصطلاحاً سحر کہا جاتا ہے۔)

"نِّعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا: یہاں پر لفظ نِعۡمَةً: فعل نَجَّیۡنَا: کا مفعول ہے یعنی ہم نے آل لوط علیہ السلام کو نجات بخشی اور یہ ان کے لئے ہمارا انعام تھا۔

کَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ مَنۡ شَکَرَ.

"ہم نے جس طرح لوط علیہ السلام اور ان کی آل کو نجات

دی' (دوسرے) شکر گزاروں کو بھی ہم ایسا ہی بدلا دیا کرتے ہیں۔"

مقام شکر وہ مقام ہے جہاں خدا کے فرامین اور احکام کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاتا ہے اور ان کی فرمانبرداری کی جاتی ہے اور نافرمانی سے گریز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو فرد بھی ان صفات کا حامل ہو گا اس کو ہم عذاب سے نجات دلائیں گے اور قیامت کے دن تک ایسا ہی ہو گا۔ اس کے لئے کوئی خاص زمانہ متعین نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بات تو سب لوگوں پر واضح ہے کہ خدا کے احکام کے فرمانبردار و شکر گزار اور اس کی معصیت اور نافرمانی سے گریزاں بے شمار افراد کو متعدد مصائب' زلزلوں' سیلاب اور بیماریوں سے نجات دی گئی ہے۔

عذاب کی ریت عام ریت کی جگہ

بعض مفسرین نے ایک نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے کہ قوم لوط پر جہنم کی ریت کی بارش اس لئے نازل کی گئی تھی' کیونکہ اس قوم کا ہر فرد ریت سے بھرا ہوا ڈبہ اپنے ہمراہ رکھتا تھا اور یہ لوگ راستوں پر بیٹھ جاتے اور آنے جانے والوں پر اس ریت کو پھینک دیتے تھے۔ چنانچہ خدا نے ان لوگوں کو سزا دیتے ہوئے ان پر جہنم کی ریت برسائی۔ قوم لوط اس حد تک غلاظت اور گندگی میں ڈوب چکی تھی کہ وہ پیشاب اور پاخانہ سے پاکیزگی' طہارت اور صفائی کو بھی اہمیت نہ دیتی تھی یہاں تک کہ وہ لوگ جنابت کا واجب غسل بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگ انسانی اور سماجی آداب اور اصولوں کو بھلا چکے تھے اور انتہائی ذلیل اور وحشیانہ حرکتوں کو بار بار دہراتے تھے (مثال کے طور پر بھری محفل میں بغیر شرم محسوس کئے ہوا خارج کرتے تھے' جس کا ہم ایک روایت میں تذکرہ کر چکے ہیں۔)

آل لوطؑ کو کس طرح نجات دلائی گئی؟

بعض مفسرین نے آل لوطؑ کی تعداد تیرہ بتائی ہے یعنی لوط علیہ السلام کی تین بیٹیاں، آپؑ کے تین داماد اور عزیز وا قارب اور کچھ پیروکار۔ چار لاکھ(۴۰۰۰۰۰) کی آبادی پر مشتمل بستیوں میں صرف ۱۳ افراد کو نجات حاصل ہوئی۔روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے حضرت لوط علیہ السلام سے فرمایا کہ تم لوگوں کو رات کے پچھلے پہر شہروں سے باہر چلے جانا ہوگا، کیونکہ صبح سویرے عذاب نازل ہونے کا وقت ہے۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ.

(ہود۔۸۱)

''اور ان کے عذاب کا وعدہ الصبح ہے کیا صبح قریب نہیں ہے۔''

لوط علیہ السلام نے فرمایا:

لوگ ہمارے مکان کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں، ہم کیونکر یہاں سے باہر جائیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے انہیں ایک نور کی شعاع دکھلائی اور فرمایا کہ تم اور تمہارے گھر والے نور کی اس شعاع سے گزرنا۔ اس طرح لوط علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے افراد کے بعد آپؑ کی زوجہ آپؑ کی قوم کو آپؑ کے فرار کا واقعہ بیان کرنے جارہی تھی کہ جہنم کی ریت کے ایک پتھر نے اس کا کام تمام کر دیا اور وہ وہیں ہلاک ہوگئی۔

خدا بہت بڑا قدر دان ہے

پروردگار عالم بے حد قدردان ہے۔ اگر کسی نے کوئی اچھائی کی ہے یا اس

کی راہ میں کوئی نیک عمل انجام دیا ہے تو خدا اس کے بدلے میں اس کو انعام دے گا۔ خدا کی قدرت اس درجہ وسیع و بے پایاں ہے کہ مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار اور فاسق و فاجر لوگوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اسی دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔ کیونکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس قسم کے لوگ بیمار نہیں ہوتے، یا ان کی امارت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ.

"اور لوط نے ان کو ہماری پکڑ سے ڈرا بھی دیا تھا مگر ان لوگوں نے ڈرانے ہی میں شک کیا۔"

بَطْش: کے معنی ہیں قہر و غضب کی شدت۔

اَنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (البروج۔ ۱۲)

"بے شک تمہارے پروردگار کی پکڑ بڑی سخت ہے۔"

یعنی کسی کی مجال نہیں کہ خدا کے قہر و غضب کو برداشت کر سکے اور اس سے بچ سکے۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو خدا کے عذاب سے ڈرایا، دھمکایا، لیکن انہوں نے ان کی کوئی پروا نہیں کی بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے (ڈرانے والوں) کے بارے میں شک کیا اور ان کی صداقت کا انکار کیا۔

وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَیْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْیُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَنُذُرِ.

"اور ان سے ان کے مہمان (فرشتے) کے بارے میں ناجائز مطلب کی خواہش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں ان کے چہروں سے مٹا دیں (اندھی کر دیں) تاکہ ہمارے عذاب اور ڈرانے کا مزہ چکھو۔)

جو فرشتے قوم لوط علیہ السلام کو ہلاک کرنے کے لئے آئے تھے ان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی شامل تھے اور بعض روایتوں کے مطابق حضرت اسرافیل اور حضرت میکائیل بھی ان فرشتوں کے ساتھ تھے سورج ڈوبنے سے قبل چار یا سات فرشتے خوبرو نوجوانوں کے بھیس میں ''موتفکات'' کے علاقے میں داخل ہوئے اور حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پر مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے۔

لوط علیہ السلام انتہائی پریشان ہوئے اور فرمانے لگے کہ کیا تمہیں معلوم نہیں، اس قوم کے لوگ کس درجہ بے غیرت ہیں، ان فرشتوں نے اپنا تعارف کرائے بغیر لوط علیہ السلام کو بتایا:

> ''ہمارے آقا نے حکم دیا ہے کہ اس بستی میں آئیں اور اب ہم آپ کے مہمان بنا چاہتے ہیں۔''

اس موقع پر لوط علیہ السلام کو شدید خوف و ہراس لاحق ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی قوم کو اس بارے میں خبر مل جائے۔ دوسری جانب آپؑ انتہائی مہمان نواز بھی تھے لہٰذا لوط علیہ السلام نے اندھیرا ہونے تک کچھ انتظار کیا تاکہ قوم کا کوئی فرد مہمانوں کو لوط علیہ السلام کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھ پائے۔

جس وقت یہ مہمان رخصت ہو رہے تھے، ان سے کہا گیا تھا کہ راستہ کے درمیان نہ چلیں بلکہ کنارے کنارے جائیں، لیکن وہ اس بات کے برعکس عمل کرتے تھے، جس کی انہیں ہدایت کی جاتی تھی اور جب انہیں لوط علیہ السلام کے اعتراض کا سامان کرنا پڑتا تو جواب میں کہتے کہ ہمارے آقا نے ایسا کرنے کے لئے حکم دیا ہے۔ آخرکار یہ مہمان حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچ گئے۔

لوط علیہ السلام کی بیوی نے جونہی اس امر کا مشاہدہ کیا کہ چند خوبرو

نوجوان اس کے گھر آئے ہیں تو اس نے مکان کی چھت پر جا کر آگ جلائی تاکہ اس کی روشنی اور اس سے اٹھنے والے دھویں سے قوم لوطؑ کے لوگ اس بات سے باخبر ہو جائیں کہ حضرت لوطؑ کے گھر مہمان آئے ہیں۔ نتیجتاً آپؑ کے مکان کے اردگرد لوگوں کا مجمع ہوتا گیا۔ لوط علیہ السلام کی بیوی نے مکان کا دروازہ کھول دیا اور جمع ہونے والے لوگوں کو لوط علیہ السلام کے مہمانوں کی جانب لے گئی۔ جونہی قوم لوطؑ کے لوگوں کی نگاہ مہمانوں کے خوبرو چہروں پر پڑی تو کہنے لگے کہ ہم نے تم سے یہ نہ کہا تھا کہ تم کسی مہمان کو گھر نہ بلاؤ گے۔ خیر اب جبکہ تم نے مہمانوں کو اپنے گھر بلا ہی لیا ہے تو ان میں سے ایک اپنے لئے رکھو اور باقی ہمارے حوالے کر دو۔

لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں کو سمجھایا اور انہیں وعظ و نصیحت کی کہ اس فعل سے شرم کرو، یہ کیسا عمل ہے جو تم نے اختیار کر لیا ہے، اس کے بعد آپ نے گھر میں داخل ہونے والے ہجوم کے دو اہم آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر تمہارا مقصد خواہش نفسانی کو روکنا ہے تو میں اپنی بیٹیوں کا تم لوگوں کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

یٰقَوۡمِ ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیۡ ھُنَّ اَطۡھَرُ لَکُمۡ (ھود . ۷۸)

"اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں (موجود) ہیں ان سے نکاح کر لو یہ تمہارے واسطے زیادہ صاف اور پاکیزہ ہیں۔"

لوط علیہ السلام کے لوگوں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور ان سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا کیا مدعا ہے۔

قَالُوۡا لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِیۡ بَنَاتِکَ مِنۡ حَقٍّ وَاِنَّکَ

لَتَعۡلَمُ مَا نُرِيۡدُ. (ھود۔ ۷۹)

''ان کم بختوں نے جواب دیا تم کو خوب معلوم ہے کہ تمہاری قوم کی لڑکیوں کی ہمیں کچھ حاجت ہی نہیں۔ اور جو بات ہم چاہتے ہیں وہ تو تم خوب جانتے ہو۔''

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِیۡ ضَیۡفِیۡ اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ. (ھود۔ ۷۸)

''تو خدا سے ڈرو اور مجھے میرے مہمان کے بارے میں رسوا نہ کرو کیا تم میں سے کوئی بھی سمجھ دار آدمی نہیں ہے۔''

لوط علیہ السلام نے اس کسمپرسی کے عالم میں لوگوں سے التجا کی تھی کہ کیا تم میں کوئی سمجھدار آدمی موجود نہیں' کیا تم میں کوئی غیرت مند شخص موجود نہیں ہے۔

بعد میں اپنے عزیز مہمانوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا:

قَالَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ.

(ھود۔ ۸۰)

''لوط علیہ السلام نے کہا کاش مجھ میں تمہارے مقابلے کی قوت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعہ میں پناہ لے سکتا۔''

کاش میرے پاس کوئی طاقت ہوتی' میرا کوئی کنبہ وقبیلہ ہوتا جس کا میں سہارا لے سکتا اور تم سے دفاع کرتا۔

وَلَقَدۡ رَاوَدُوۡہُ عَنۡ ضَیۡفِهٖ:

''انہوں نے ہر طرح سے مہمانوں کا مطالبہ کیا۔''

"مُواوَدَۃ" کے معنی ہیں مطالبہ کرنا یا کھینچا تانی اور بحث کرنا چنانچہ قوم لوط کے لوگ اس موقع پر مکان کا دروازہ توڑ کر حضرت لوط علیہ السلام کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اب کافی دیر ہو چکی تھی اور عذاب الٰہی نازل ہونے کا وقت قریب آ چکا تھا۔ اب جبکہ لوط علیہ السلام کی صدا و فریاد بلند ہوئی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنا تعارف کروا دیا اور فرمایا:

"ہم فرشتے ہیں اور تمہارے رب کی جانب سے اس قوم کو ہلاک کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔"

اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْآ اِلَیْکَ. (ھود . ۸۱)

"ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں تم گھبراؤ نہیں یہ لوگ تم تک ہرگز دسترس نہیں پا سکتے۔"

ان فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے فرمایا انہیں اندر آنے دو۔ اس موقع پر پورا مکان مجمع سے بھر چکا تھا۔ جبرائیل علیہ السلام نے اپنے پر سے گھر میں داخل ہونے والے لوگوں کی آنکھوں پر ضرب لگائی اور یہ تمام کے تمام لوگ اندھے ہو گئے۔ نہ صرف اندھے ہوئے بلکہ ان کی آنکھیں ان کے چہروں سے مٹ گئیں اور آنکھوں کی جگہ ہتھیلی کے مانند صاف ہو گئی اور آنکھوں کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا۔

فَطَمَسْنَا اَعْیُنَھُمْ

"ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں"

یعنی ان کے چہرے پر آنکھوں کے نام و نشان تک باقی نہ رہے اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے کہ ان کے چہروں پر آنکھوں کا وجود ہی نہیں تھا۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَنُذُرِ.

”تو میرے عذاب اور ڈرانے کا مزا چکھو۔“

چنانچہ ہم نے قوم لوط سے فرشتوں کی زبانی اور لوط علیہ السلام کے ذریعہ کہا:

”اب تم میرے عذاب اور ڈرانے کا مزہ چکھو۔“

قوم لوط علیہ السلام کے لوگ اس الٰہی قہر کے بعد بھی اپنی بد اعمالیوں سے تائب نہ ہوئے، غفلت کی نیند سے نہ جاگے اور اپنے کئے پر پشیمان نہ ہوئے اور بارگاہ الٰہی میں اپنے گناہوں سے توبہ نہ کی، وہ خدا و روز قیامت پر ایمان لانے کی بجائے حضرت لوط علیہ السلام کو فحش دشنام کا ہدف قرار دیتے ہوئے کہتے کہ حضرت لوط علیہ السلام جادوگروں کا ایک گروہ لے کر آئے ہیں۔

اب کیونکہ یہ لوگ کثیر تعداد میں تھے اپنے لئے وہ انتقام لینے کے درپے ہو گئے لیکن وہ اس حد تک خائف اور دہشت زدہ ہو چکے تھے کہ انہیں معمولی سے معمولی قدم اٹھانے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ فرشتوں نے قوم لوط علیہ السلام سے فرمایا:

”ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان پر صبح سویرے عذاب نازل کریں۔ لوط علیہ السلام نے فرشتوں سے درخواست کی کہ اسی وقت ان پر عذاب نازل کرو۔ فرشتوں نے جواب میں فرمایا کیا صبح قریب نہیں ہے؟“

اِنَّ مَوْعِدَھُمُ الصُّبْحُ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ. (ھود۔ ۸۱)

”اور ان کے عذاب کا وعدہ بس صبح ہے کیا صبح قریب نہیں ہے۔“

دائمی عذاب

وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ.

''اور صبح سویرے ہی ان پر عذاب آ گیا جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا تھا۔''

تَصَبُّحٌ: کا لغوی معنی کسی چیز یا شخص کا صبح سویرے آنا اور طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک کے عرصے پر لفظ صبح کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان پر صبح سویرے ہی عذاب آ گیا۔

بُكْرَةً: کا لغوی مفہوم بھی طلوع فجر یا صبح سویرا ہے اور یہاں پر یہ لفظ تاکید کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

یہ عذاب جو ان پر صبح سویرے ہی آ گیا۔ مُسْتَقِرٌّ: دائمی اور ابدی عذاب ہے کیونکہ یہ عذاب روز قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ الفاظ دیگر یہ عذاب ان کی ہلاکت اور جہنم میں پہنچانے تک رفع نہ کیا گیا۔

جس وقت عذاب نازل کیا گیا حکم ہوا کہ بستی کو انتہا درجہ تک بلند کیا جائے۔ اس ضمن میں دو روایتیں نقل ہوئیں، پہلی روایت کے مطابق دو فرشتوں نے

بستی کو چاروں کناروں سے بنیادوں سمیت اکھاڑ پھینکا اور دوسری روایت کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام نے یہ کام تن تنہا انجام فرمایا۔

چار لاکھ آبادی والی اس عظیم بستی میں سے جو ایک دوسرے سے متصل چار شہروں پر مشتمل تھی صرف حضرت لوط علیہ السلام کا گھر بچا تھا جبکہ آپؑ کے گھر کے گرد واقع چاروں اطراف کے علاقے اکھاڑ دیئے گئے تھے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ.

(الذاریت:۳۶)

''تو ہم نے (اس بستی میں) ایک کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر پایا بھی نہیں۔''

روایات کے مطابق ان چاروں شہروں کو بنیادوں سے اکھاڑ کر اس قدر بلند کیا گیا کہ آسمانوں کے مکینوں کو ان کے مرغوں کی اذانوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان شہروں پر پتھروں کی بارش کیئے جانے کے بعد اس بستی (علاقے) کی زمین کے طبقے الٹ کر اس کے اوپر کے حصے کو اس کے نیچے کا حصہ بنا دیا (اس بستی کو الٹ کر) زیر و زبر کر دیا۔

عَذَابٌ مُّسْتَقَرٌّ: یعنی ابدی اور دائمی عذاب' یہ دائمی اور حقیقی عذاب کا پیش خیمہ تھا اور موت کے آغاز سے عالم برزخ اور قیامت کے دن اور اس کے بعد آنے والے دائمی عذاب کے مراحل کی ہولناکیاں ناقابل بیان ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا

هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ. (ھود۔ ۸۲، ۸۳)

''پھر جب ہمارا (عذاب کا) حکم آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو الٹ کر زیر و زبر کر دیا اور اس پر ہم نے کھرنجے دار پتھر تا بڑ توڑ برسائے۔ جن پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نشان بنائے ہوئے تھے اور بستی ان ظالموں (کفار مکہ سے) سے کچھ دور نہیں''

یاد الٰہی سے معمور کوئی بھی مقام محترم ہوتا ہے

ہم یہاں پر ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ قوم لوط علیہ السلام کی بستی پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کو بچا لیا گیا تا کہ قیامت کے دن تک آنے والے انسانوں کے لئے عبرت کی نشانی کے طور پر باقی رہے، یقیناً یاد الٰہی نے معمور کوئی بھی مقام لائق صد احترام ہوتا ہے۔

ایک روایت میں منقول ہے کہ جب قیامت کے روز زمین پر زلزلہ آئے گا، جس سے تمام پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور پوری زمین کی سطح ہموار ہو جائیگی تو اس قسم کے زلزلہ سے مساجد اور اللہ کے گھروں کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ مسجد وہ مقام ہے جو یاد الٰہی سے معمور ہے اس لئے قیامت کا زلزلہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا.

(طٰہٰ۔ ۱۰۵)

''اور اے رسول تم سے یہ لوگ پہاڑوں کے بارے میں پوچھا کرتے ہیں کہ (قیامت کے دن) کیا ہونگے تو تم کہدو کہ میرا

پروردگار انہیں بالکل ریزہ ریزہ کر دے گا۔"

لَّا تَرٰی فِیۡهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمۡتًا. (طه . ۱۰۷)

"اور زمین کو چٹیل میدان بنا دے گا (ہموار میدان کر چھوڑ دے گا)

جس میں نہ تم کجی اور پستی دیکھو گے نہ ٹیلہ اور بلندی"

مزید معلومات کے لئے آیت اوراللہ شہید دست غیب کی کتاب "معاد" کو ملاحظہ فرمائیں۔

مومنین کو چاہئے کہ مساجد کی عظمت اور اہمیت کو سمجھیں اور ان کے آداب سے روشناس ہوں، خاص طور پر مسجد کے احترام کو قائم رکھیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس کے احترام کو باقی رکھنا ان کے اپنے ہی مفاد میں ہو گا اور قیامت کے دن یہی مسجد ان کی شفاعت کرے گی۔

فَذُوۡقُوۡا عَذَابِیۡ وَنُذُرِ.

"تو میرے عذاب اورڈرانے کا مزہ چکھو۔"

پروردگار عالم اس آیہ مبارکہ فَذُوۡقُوۡا عَذَابِیۡ وَنُذُرِ. یعنی تو میرے عذاب اور ڈرانے کا مزا چکھو کا ذکر کرنے کے بعد:

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ.

"اور ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے واسطے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔"

خدا اس آیہ مبارکہ کو ایک بار پھر دہراتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ ذِکۡرِ کے معنی ہیں یاد رکھنا یا حفظ کرنا"

قرآن مجید کی دیگر کتب آسمانی سے جداگانہ اور منفرد معجزانہ خصوصیات کے

علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا حفظ کرنا اور یاد کرنا آسان و سہل ہے۔
قرآن مجید کی ایک آیت مبارکہ، ایک سورۂ مبارکہ یا کہ تمام کا تمام کلام ازبر یاد کرنا اور حفظ کرنا آسان قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے ناخواندہ اور ان پڑھ افراد بھی کسی ایک سورۂ مبارکہ کو بار بار دہرانے کے سبب ازبر یاد کر لیتے ہیں۔ عرب ممالک اور برصغیر پاک و ہند میں آج بھی حافظ قرآن موجود ہیں۔ قرآن مجید کو حفظ کرنے کے مسئلہ کو صدر اسلام میں خاصی اہمیت حاصل تھی۔ اسی بنا پر اس دور میں حفاظ قرآن کی تعداد قابل ملاحظہ تھی، مسیلمہ کذاب، جھوٹی نبوت کے ایک مدعی کے ہاتھوں جنگ میں ستر کے قریب حافظ قرآن شہادت کے رتبہ پر فائز ہوئے۔

چنانچہ حضرت سعید بن جبیر سے منقول تفسیر کے مطابق اس آیہ مبارکہ کا مفہوم ہو گا: ہم نے قرآن کو حفظ کرنے کے لئے سہل و آسان کر دیا تو کوئی ہے جو اسے حفظ کرے۔

''ذکر باللسان'' (زبان کا ذکر)

ذکر جس کا معنی یاد ہے اس کے بھی کئی درجے ہیں اور پروردگار عالم نے ذکر کی تمام اقسام اور درجات کو آسان قرار دیا ہے۔ چنانچہ ذِکْرُ باللسان نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے جو بذات خود قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت شمار کی جاتی ہے۔

کتاب ''انیس الاعلام'' میں منقول ہے کہ مسلم دیہاتوں میں رہنے والے ان لوگوں کی تعداد جنہیں قرآن مجید ازبریاد ہے یا حفظ ہے انجیل کے بزرگ عیسائی حافظوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ نیز اسلامی ممالک خاص طور پر مصر میں ایسے افراد

موجود ہیں جو مکمل قرآن مجید کے حافظ ہیں جبکہ عیسائی ممالک میں ایسا ایک فرد بھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا جس کو عہد نامہ جدید چاروں اناجیل از بریاد ہو۔ اسی طرح عہد نامہ عتیق'' یہودیوں کی اسفار توریت کے سلسلہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔

ذکر خفی یا ذکر قلبی

ذکر قلبی بھی ذکر کی ایک قسم ہے بہ الفاظ دیگر انسانی فطرت میں موجود ہے کہ خدا کی فطرت جو انسان کو ابدی زندگی کے مقام فضائل اور نیکیاں حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور غفلت و مادی فطرت کی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ انسانی ذہن ہے۔

انسانی فطرت و جبلت میں موجود معرفت الٰہی جو انسان کو ابدی زندگی کے تحفظ کی خاطر فضائل اور اعمال صالحہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن عالم اسباب اور مادی جبلت کی خواہشات کے حصول کی وجہ سے ذہن سے اتر چکی ہے اور اس پر پردۂ نسیاں آ گیا ہے، وہ دراصل ذکر قلبی یا ذکر خفی ہے ۔ چنانچہ قرآن مجید انتہائی آسانی کے ساتھ غفلت کے دبیز پردوں کو اس کی ابتدائی فطرت کی جانب متوجہ کر سکتا ہے تاہم یہ تاثیر صرف ان انسانوں پر صادق آتی ہے جن میں بنیادی فطرت کی یاد مکمل طور پر ختم نہ ہوئی ہو اور ان کے دل مردہ نہ ہوئے ہوں ۔

فَاِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی (الروم . ۵۲)

''(اے رسولؐ!) تم تو اپنی آواز کو نہ مردوں ہی کو سنا سکتے ہو۔''

جب دل پر سیاہی چھا جائے تو وعظ و نصیحت سے کیا حاصل؟ کیونکہ لوہے کا

کیل بھی پتھر میں پیوست کرنا ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب باوفا کے مواعظ و نصائح بھی ملعون ابن زیاد کے لشکر پر معمولی سا بھی اثر انداز نہ ہو سکے۔

مرحوم طبرسی نے بھی "ذکر" کا یہی مفہوم بیان کیا ہے لیکن دیگر تمام مفسرین فرماتے ہیں کہ ذکر کے معنی یاد دلانا اور متذکر کے معنی آگاہ ہونے والا ہے۔

فرعون اور اس کے پیروکاروں کی داستاں

وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ.

''اور فرعون کے لوگوں کے پاس بھی ڈرانے والے پیغمبر آئے۔''

یعنی فرعون اور اس کے پیروکاروں کے پاس موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام آئے۔ لیکن

كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا.

''تو ان لوگوں نے ہماری سبھی نشانیوں کو جھٹلایا۔''

كُلِّهَا: سے مراد وہی نو نشانیاں ہیں جو ان کے لئے بھیجی گئیں تھیں۔ اور جو قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں پر ہم ان نشانیوں کی جانب اجمالی طور پر اشارہ کر رہے ہیں۔

عصائے موسیٰ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا حیرت انگیز معجزہ جس کے سامنے ہر شخص کو سرِ تسلیم خم کرنا چاہئے، آپؑ کی لاٹھی یا عصا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب

اس عصا کو زمین پر پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا اور فرعون کے محل کو اپنے دونوں ہونٹوں کے درمیان دبوچ لیا۔ فرعون اس ہولناک منظر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قدموں پر گر پڑا اور آپؑ سے منت سماجت کی کہ عصا کو اپنی اصلی حالت میں لوٹا لیں۔

اسی عصا نے اژدھا بن کر جادوگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کو بھی نگل لیا تھا۔

وَاَلْقِ مَا فِی یَمِیْنِکَ تَلْقَفْ مَاصَنَعُوْا.(طه . ٦٩)

''اور جو چیز، یعنی لاٹھی: تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے اسے ڈال دو تاکہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اس کو نگل جائے۔''

اسی عصا کو دریا پر مارا تھا جس سے دریائے نیل ایک جگہ پر رک گیا تھا اور راستہ بن گیا تھا۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ. (البقره . ٥٠)

''اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور ہم نے تجھے نجات دلوائی۔''

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا. (البقره . ٦٠)

''تو ہم نے کہا اے موسیٰؑ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، لاٹھی مارتے ہی اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔''

موسیٰؑ کا خدا بیدار ہے

جادوگروں نے باہمی صلاح و مشورہ کیا کہ جب موسیٰ بن عمران علیہ السلام سو رہے ہونگے تو ہم جا کر اسے چوری کر لیں گے۔ اگر طلسماتی کرشمہ جادو ہوا تو

ہم عصا کو چوری کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اگر طلسماتی کرشمہ اور جادو نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کے عالم خواب اور عالم بیداری میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ چنانچہ جادوگر جونہی عصا چرانے گئے تو اس نے اژدھے کی شکل اختیار کر لی اور ان پر حملہ آور ہوا۔ تمام جادوگر بھاگ نکلے اور دوسرے لوگوں نے جا کر کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سو رہے ہیں لیکن ان کا خدا بیدار ہے۔

ید و بیضاء

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا معجزہ ید و بیضاء تھا۔ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنے ہاتھ کو سمیٹ کر اپنی بغل سے لگا لیتے اور اسے نکال لیتے تو اس میں چاند کی مانند ایک نور ظاہر ہو جاتا تھا۔

وَاضۡمُمۡ يَدَکَ اِلٰى جَنَاحِکَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى. (طه . ۲۲)

"اور اپنے ہاتھ کو سمیٹ کر بغل میں تو کر لو پھر دیکھو وہ کسی عیب و بیماری کے بغیر چمکتا دمکتا ہوا نکلے گا۔ یہ دوسرا معجزہ ہے۔"

دریا کی خوفناک طغیانی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تیسرا معجزہ دریائے نیل کی خوفناک طغیانی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی ہر قسم کی کوشش کے باوجود فرعون اور اس کے پیروکار ایمان نہ لائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے آخر کار فرعون اور اس کے پیروکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اے! میری قوم "بنی اسرائیل" کو قید سے رہا کر دو تا کہ ہم یہ ملک چھوڑ دیں۔

فرعون کے وزیر ھامان نے فرعون سے کہا اگر بنی اسرائیل کو رہائی مل گئی تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر ہماری سلطنت کے خلاف بغاوت کریں گے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کو دریائے نیل پر مارا اور دریا میں ہولناک طغیانی آ گئی۔

فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ. (الاعراف . ۱۳۳)

''تب ہم نے ان پر پانی کے طوفان اور ٹڈیوں اور جوؤں اور مینڈکوں اور خون کا عذاب بھیجا۔ یہ کہ سب جدا جدا ہماری قدرت کی نشانیاں تھیں۔ اس پر بھی وہ لوگ تکبر ہی کرتے رہے اور وہ لوگ گنہگار تو تھے ہی۔''

جس کے نتیجے میں فرعون اور اس کے ہمنواؤں کے محلات اور گھر پانی میں ڈوب گئے اور تمام لوگ جنگلوں اور ریگستانوں کی جانب بھاگ نکلے۔ حیرت اور تعجب کا مقام یہ تھا کہ جب پانی بنی اسرائیل کے گھروں کے قریب پہنچا تو ان میں داخل نہیں ہوا۔

قصہ مختصر تمام کھیت کھلیان تباہ ہو گئے اور انتہائی مشکل اور دشوار حالات سے دو چار ہو گئے۔ فرعون نے مجبور ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغام بھیجا کہ اگر دریائی طغیانی اور طوفان کو ختم کر ڈالو تو بنی اسرائیلؑ کے تمام لوگوں کو رہا کر دوں گا۔

لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی سے اس عصا کو دریائے نیل پر مارا تو طوفان تھم گیا تاہم فرعون نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور بنی اسرائیل کو رہا نہ کیا۔

چوتھا معجزہ ٹڈیوں کا عذاب

فرعون اور اس کے پیروکاروں پر ٹڈیوں کو مسلط کیا گیا تھا اور یہ موسیٰ علیہ السلام کا چوتھا معجزہ تھا۔ یہ ٹڈیاں عام ٹڈیاں نہ تھیں بلکہ عجیب قسم کی ٹڈیاں تھیں جو نہ صرف سبزیوں اور فصلوں کو کھاتی تھیں بلکہ کپڑوں، دروازوں، کھڑکیوں، دریچوں یہاں تک کہ لکڑیوں اور لوہے کی سلاخوں کو بھی کھا جاتیں۔ نیز ان کے سر اور داڑھی مونچھوں کے بالوں کو بھی اکھاڑ دیتی تھیں۔ لیکن بنی اسرائیل کے کسی بھی فرد کے گھر میں داخل نہ ہوئیں اور انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا۔

آخر کار سب لوگ تنگ آ گئے۔ فرعون نے اس بار پھر موسیٰ علیہ السلام کو پیغام دیا کہ اگر ہمیں ان ٹڈیوں سے نجات مل گئی تو ہم بنی اسرائیل کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا فرمائی اور ٹڈیوں کا عذاب ٹل گیا۔ لیکن فرعون نے اس بار بھی عہد شکنی کی اور بنی اسرائیل کو رہا نہ کیا۔ ان سب باتوں کے باوجود خدا کے حلم و بردباری اور مہلت کو بھی مدنظر رکھیے۔

پانچواں عذاب جوؤں کا مسلط ہونا

پروردگار عالم نے فرعون اور اس کی قوم پر جوؤں کو مسلط کر دیا تھا۔ روایت کے مطابق یہ جوئیں فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کے جسموں کو اس طرح کاٹتی تھیں کہ ان کے جسم پر آبلے پڑ جاتے تھے اور وہ زخموں کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ قصہ مختصر اس عذاب کے باعث ان لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئیں تھیں۔

یہ جوئیں ان کے کپڑوں برتنوں اور کھانے پینے کی اشیاء میں بھی چلی جاتی

تھیں۔ چنانچہ ان کے استعمال میں آنے والی خورد ونوش کی تمام اشیاء میں جوئیں ملی ہوئی ہوتی تھیں۔

اس قوم کے لوگ پانچویں عذاب سے تنگ آ کر ایک بار پھر موسیٰ علیہ السلام کی منت سماجت کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان سے وعدہ کیا کہ جوؤں کا عذاب ٹل جانے پر بنی اسرائیل کو قید سے آزاد کر دیا جائے گا لیکن مشکل کے خاتمے پر انہوں نے پھر سے وعدہ خلافی کی۔

فرعون اور اس کی قوم پر مینڈک مسلط کئے گئے

موسیٰ علیہ السلام نے چھٹی بار حکم الٰہی سے فرعون اور اس کی قوم پر مینڈکوں کو مسلط کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اسی عصا کو دریائے نیل پر مارا تو دریا میں موجود تمام مینڈک پانی سے باہر نکل آئے اور جوق در جوق شہر میں پھیل گئے۔ حال یہ ہو چکا تھا کہ ان کے کپڑوں، برتنوں، گھروں میں مینڈک ہی مینڈک نظر آنے لگے۔ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ جہاں پر بھی بیٹھتے تھے، کوئی نہ کوئی مینڈک وہاں آ ٹپکتا تھا۔ ان مینڈکوں نے ان کے جسموں پر اور کبھی ان کے سروں پر چڑھ کر، فرعون اور اس کی قوم کا جینا دو بھر کر دیا۔ یہاں تک کہ جب وہ کھانا کھاتے تھے اور لقمہ کو منہ میں ڈالنے کے لئے توڑتے تھے تو اس سے قبل مینڈک ان کے منہ میں داخل ہو جاتا تھا اور حسب سابق فرعون نے اس دفعہ بھی موسیٰؑ سے وعدہ کیا کہ آئندہ عہد شکنی نہ کرے گا۔ لیکن افسوس اس نے پھر اپنا وعدہ نہ نبھایا۔

دریائے نیل کے پانی کا خون میں تبدیل ہونا

موسیٰ علیہ السلام نے ساتویں بار اپنے عصا کو دریائے نیل پر مارا تو اس کا

پانی خون میں تبدیل ہو گیا' نہ صرف دریا کا پانی خون ہوا بلکہ جہاں سے بھی پانی حاصل کرتے وہ خون میں تبدیل ہو جاتا تھا' جبکہ بنی اسرائیل کے لئے یہ پانی اپنی اصل ہیئت میں باقی رہتا تھا۔

روایات کے مطابق فرعون بھی اس عذاب میں مبتلا تھا اور اپنی پیاس کو بجھانے اور ہلاکت سے نجات کے لئے درختوں کے پتوں کو چوسنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن جب چوسے ہوئے پتوں کا پانی اس کے منہ میں جمع ہو جاتا تو وہ بھی خون کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ فرعون اور اس کی قوم کے ذہنوں میں اس عذاب سے نجات کے لئے ایک چال سوجھی۔ چنانچہ انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم لوگ اپنے ہاتھوں سے ہمیں پانی دو چنانچہ جب تک پانی بنی اسرائیل کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا تو وہ پانی ہی رہتا' لیکن فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کے ہاتھوں میں جاتے ہی وہ خون بن جاتا تھا۔ یہ قوم پھر بھی اپنے عناد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آئی اور ایک اور مکر و فریب کا راستہ اختیار کیا۔ اب وہ بنی اسرائیل کے لوگوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ پانی کو اپنے منہ کے ذریعے ہمارے منہ میں ڈالو لیکن جب تک وہ پانی بنی اسرائیل کے منہ میں رہتا تو وہ پانی ہوتا اور جونہی فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کے منہ میں داخل کیا جاتا تو وہ خون کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

قیامت کے دن نیکی اور برے لوگوں کے لئے زمین کی حالت

اس بات کا تو آپ کو علم ہے کہ قیامت کے دن زمین کی گرمی کی شدت لوہا پگھلانے والی بھٹی کی مانند ہو گئی' جبکہ مؤمن جب زمین پر اپنا قدم رکھے گا تو

اسے ٹھنڈی محسوس ہوگی۔ اس کے لئے بَرْدًا و سَلَامًا یعنی سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہوگی اس کی ٹھنڈک ایسی نہ ہوگی جو مومن کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔ جبکہ وہی زمین منافق اور کافر کے لئے آگ کے شعلے سے بھی زیادہ گرم ہوگی۔

اب آپ فرعون اور اس کی قوم کے حالات کو ہی ملاحظہ کریں' وہ لوگ بنی اسرائیل کے لوگوں سے کہتے تھے کہ اپنے منہ کے ذریعے ہمارے منہ میں پانی داخل کرو۔ لیکن فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کے منہ میں پانی داخل ہوتے ہی خون بن جاتا تھا۔ قیامت کے دن بھی گمراہی و ضلالت میں رہنے والے جبروت و طاغوت کے پیروکار مؤمنین سے کہیں گے:

ہماری طرف نگاہ کرو تاکہ تمہارے نور کی روشنی میں ہمیں اپنے آگے کا راستہ سجھائی دے۔" مؤمنین آپ کو جواب دیں گے کہ ہمارا نور تمہارے کسی کام کا نہیں تمہیں دنیا میں سے اپنا نور اپنے ہمراہ لانا ہوگا' واپس لوٹ جاؤ اور کسی نور کا انتظام کرو۔

اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۔ (الحدید۔۱۳)

"ایک نظرِ شفقت' ہماری طرف بھی کرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کریں۔"

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا. (الحدید۔۱۳)

"(ان سے) کہا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے (دنیا میں) لوٹ جاؤ اور وہیں کسی نور کی تلاش کرو۔"

بہرحال ہر شخص اپنے لئے کچھ نہ کچھ زادِ راہ کا انتظام کرے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہر شخص تنہا ہوگا اور اس کے عمل کے سوا اور کچھ ساتھ نہ ہوگا' اس

وقت کو غنیمت سمجھو اور آنے والے کل کے بارے میں کچھ سوچو اور اپنی فکر کرو دوسروں سے تمہیں کیا غرض، اگر تم خود ہدایت یافتہ ہو جاتے ہو تو دوسروں کی گمراہی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ. (المائدہ۔۱۰۵)

''اے ایمان والو! تم اپنی خبر لو۔ جب تم راہ راست پر ہو، تو کوئی گمراہ ہوا کرے، تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مجھے یہ بھی خوف ہے کہ اس دن (قیامت) نور کی کمی کی وجہ سے آہ و زاری کریں اور یہ زبان حال سے کہیں۔''

رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا. (التحریم۔۸)

''پروردگار ہمارے لئے ہمارا نور پورا کر۔''

کیونکہ انجام کار کسی شخص کو بھی مرنے اور قبر میں جانے کے بعد دوبارہ دنیا میں لوٹایا نہیں جائے گا۔ انسان کتنی بھی آہ و زاری اور منت سماجت کرے کہ پروردگار مجھے دنیا میں واپس لوٹا دے تاکہ میں نیک اعمال بجا لاؤں، صدقہ و خیرات کروں یا کوئی نیکی کر پاؤں۔

حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحاً فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ. (المومنون۔۱۰۰)

''اور کفار تو مانیں گے نہیں، یہاں تک جب ان میں کسی کو موت آئی تو کہنے لگے گا! ''پروردگار تو مجھے ایک بار اس مقام (دنیا)

میں، جسے میں چھوڑ آیا ہوں، پھر واپس کر دے تا کہ میں اب کی دفعہ اچھے کام کروں، جواب دیا جائے گا: ہرگز نہیں یہ ایک لغو بات ہے جسے وہ بک رہا ہے اور ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ ہے (جہاں) اس دن تک کہ دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے، رہنا ہوگا۔"

چنانچہ ایسے شخص کی خواہش پوری نہ ہو گی اور اسے منفی جواب ملے گا۔ کیونکہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

خشک سالی ۔ ژالہ باری

پروردگار کی نو نشانیوں میں سے آٹھویں نشانی جس کے بارے میں فرعون اور اس کی قوم نے لاپروائی سے کام لیا۔ نیز اس قوم نے دکھائے جانے والے عذاب ومعجزات کو بھی قبول نہ کیا۔ جبکہ سمعی نشانیوں کو جو ہماری عظیم نشانیاں یعنی انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام ہیں کو بھی جھٹلایا۔

اور جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ ایک پیغمبر کو جھٹلانا تمام پیغمبروں کو جھٹلانے کے مترادف ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا

زمانہ گزرتا گیا اور بنی اسرائیل کی تکالیف ومصائب وآلام میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے گزارش کی کہ فرعون اور اس کی قوم کے لئے بارگاہ الٰہی میں بددعا فرمائیں۔ موسیٰ علیہ السلام یہ جانتے ہوئے کہ بنی اسرائیل پر مشکلوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، خدا کے حضور فرمایا:

وَقَالَ مُوسٰی رَبَّنَآ اِنَّکَ آتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهٗ زِیْنَةً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ. (سورہ یونس ۔ ۸۸)

''موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا:''اے ہمارے پالنے والے تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دینوی زندگی میں بڑی آرائش اور دولت دے رکھی ہے (کیا تو نے یہ سامان اس لئے عطا کیا ہے) کہ یہ لوگ تیرے راستے سے لوگوں کو بہکائیں۔ پروردگارا! تو ان کے مال و دولت کو غارت کر دے اور ان کے دلوں پر سختی کر کیونکہ جب یہ لوگ تکلیف دہ عذاب نہ دیکھ لیں گے' ایمان نہ لائیں گے۔''

یقیناً مال و جاہ و جلالِ دنیا غرور و تکبر کا موجب بنتا ہے۔ اس بد دعا کے بعد فرعون اور اس کی قوم کا سارا مال و متاع یہاں تک کہ خورد ونوش اور اناج وغیرہ نیز ان کے مویشی تمام کے تمام پتھر بن گئے اور استعمال کے قابل نہ رہے۔

بنی اسرائیل کا فرار

بعد میں پروردگار عالم کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کو اجازت ملی کہ بنی اسرائیل کے ہمراہ رات کے وقت شہر سے نکل جائیں تا کہ فرعون اوراس کی قوم پر عذاب نازل کیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا گیا کہ ہم بنی اسرائیل کو امن و سلامتی کے ساتھ دریائے نیل سے پار کرا دیں گے لیکن جب چاند طلوع ہو جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بھی ان تمام باتوں سے باخبر کر دیا تھا۔

بنی اسرائیل کے لوگ ایک ایک کر کے شہر سے باہر نکل گئے اور شہر کے باہر ایک مقام پر جمع ہو گئے اور دریائے نیل کے کنارے پر آ کر ٹھہر گئے' اب بنی اسرائیل کو دریائے نیل عبور کرنا تھا۔ لیکن چاند ابھی تک طلوع نہ ہوا تھا۔

حضرت یوسفؑ کے جسد کو بھی اپنے ہمراہ لے جاؤ

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس موضوع کی تفصیلات میں متعدد معتبر روایات موجود ہیں جن کے بیانات کچھ اس طرح ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار عالم کی بارگاہ میں عرض کی۔ پروردگارا! چاند کیونکر طالع نہ ہوا؟ بارگاہ رب العزت سے آواز آئی کہ یوسف علیہ السلام پیغمبر کے جسد (جسم) کو بھی تمہیں اپنے ہمراہ لے جا کر اسے سپرد خاک کرنا ہو گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا جسم مبارک پتھر سے بنے تابوت میں رکھا گیا تھا اور دریائے نیل کے کسی مخصوص مقام پر اسے رکھا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

> "کیا تم میں سے کوئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے جسم مبارک کے بارے میں علم رکھتا ہو کہ وہ کس مقام پر رکھا گیا ہے۔"

اس بات کا کسی کو بھی علم نہ تھا صرف ایک نابینا اور مفلوج بوڑھی عورت بول اٹھی میں جانتی ہوں لیکن میری کچھ حاجتیں ہیں' جب تک میری یہ حاجتیں پوری نہیں کی جاتیں میں نہیں بتاؤں گی۔

موسیٰ علیہ السلام نے اس سے سوال کیا کہ تمہاری کیا حاجتیں ہین۔ اس بوڑھی عورت نے کہا کہ میری ایک حاجت یہ ہے کہ میں دوبارہ جوان ہو جاؤں'

دوسری حاجت یہ ہے کہ مجھے فالج سے نجات مل جائے' تیسری حاجت یہ ہے کہ میری آنکھوں کی روشنی واپس مل جائے اور آخری حاجت یہ ہے کہ جنت میں آپ کی زوجہ بن جاؤں۔

موسیٰ علیہ السلام اس کے جواب میں خاموش ہو گئے۔ اوپر وحی الٰہی ملی کہ اس بوڑھی عورت کی تمام حاجات کی برآوری ہمارے ذمے ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی اور اس کی تمام حاجتیں پوری ہوگئیں اور وہ اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس جوان عورت نے روشن آنکھوں کے ہمراہ بنی اسرائیل کی رہنمائی کی اور انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا جسم مبارک دکھا دیا۔

اس طرح بنی اسرائیل تابوت کو اٹھا کر دریائے نیل کے کنارے لے آئے۔

فرعون بنی اسرائیل کا پیچھا کرتا ہے

تھوڑے عرصہ میں موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے فرار کی خبر فرعون کو مل گئی۔ اس نے فی الفور عوامی اجتماع اکٹھا کیا۔ اس طرح دس لاکھ ساٹھ ہزار افراد موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کے لئے چل پڑے تاکہ وہ انہیں قید کرسکیں۔ فرعون نے اپنے لشکر کو جوش دلایا اور کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی نفری کی تعداد انتہائی کم اور مٹھی بھر کی ہے اور ان لوگوں نے ہم سب کو غصہ دلایا ہے۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حٰشِرِيْنَ. (الشعراء۔۵۳)

''تب فرعون نے لشکر جمع کرنے کے خیال سے تمام شہروں میں

دھڑا دھڑ ا ہرکارے روانہ کئے۔''

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرذِمَةٌ قَلِيلُونَ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُونَ.

(الشعراء . ۵۵)

''اور کہا کہ یہ لوگ جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہیں، مٹھی بھر جماعت ہیں اور ان لوگوں نے ہمیں سخت غصہ دلایا ہے۔''

لشکر کے مقدمہ میں جب فرعون نمودار ہوا تو بنی اسرائیل گھبرا گئے اور انہیں شدید خوف لاحق ہوا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب ہم سب لوگ گرفتار کر لئے جائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خدا کا وعدہ برحق اور سچا ہے اور ہم تمام لوگ سلامتی سے دریا کو عبور کرلیں گے۔

یوشعؑ پانی پر چلتے ہیں

ایک روایت کے مطابق حضرت یوشعؑ موسیٰ علیہ السلام کے وصی و نائب نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ خدا کا وعدہ کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا خدا ہمیں پانی سے نجات دے گا۔ یوشع یہ بات سنتے ہی پانی پر چل پڑے اور دریا عبور کرلیا۔ لیکن بنی اسرائیل کو پانی پر چلنے کی ہمت نہ ہوئی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ دریا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تا کہ ہم دریا کو عبور کر سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی! پروردگار عالم تجھے محمد و آل محمد علیھم الصلوٰۃ والسلام کا واسطہ ہے کہ دریا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

پانی کی دیواروں میں دریچے بن گئے

جب دریا دو ٹکڑے ہوگیا، بنی اسرائیل نے کہا ہمارے بارہ قبیلے ہیں اور

دریا عبور کرتے وقت ممکن ہے ہم آپس میں جھگڑ پڑیں اس لئے ہر قبیلے کے لئے الگ الگ راستہ نکالیں ۔ موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو پانی پر مارا تو دریائے نیل میں بارہ رستے' گلیاں بن گئے اور ان راستوں کے دونوں جانب پانی کی دیواریں پہاڑوں کے سلسلے کی مانند تلاطم خیز تھیں۔

بنی اسرائیل نے کہا' دریا کی زمین دلدلی ہے اور ہمارے پاؤں اس میں دھنس رہے ہیں۔ بنی اسرائیل کے لوگوں کا ایمان اس درجہ ضعیف تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ اس حد تک ضعیف الاعتقاد تھے کہ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ جب خدا کا وعدہ ہو چکا ہے کہ پانی سے سلامتی کے ساتھ گزر جاؤ گے تو اس کے بعد پروردگار عالم کبھی وعدہ خلافی نہیں فرماتا۔ چنانچہ دریا کی دلدلی زمین بھی مضبوط ہو گئی اور اب ان کے قدم اس میں دھنس نہیں رہے تھے۔

شدید ہوا چلی اور تمام راستوں کی دلدلی زمین خشک ہو گئی۔ مختصر یہ کہ وہ دریائے نیل میں بارہ جدا جدا راستوں پر چل پڑے۔

موسیٰ علیہ السلام کو اچانک یہ آواز سنائی دی کہ ہمارے ساتھی ڈوب گئے ہیں' ہمارے عزیز واقارب ہلاک ہو گئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار عالم سے درخواست فرمائی کہ بارہ رستوں کے درمیان حائل پانی کی دیواریں جالی دار بن جائیں تا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ایک دوسرے سے باخبر رہیں اور ان کی سلامتی کا انہیں یقین ہو جائے۔

آخر کار تمام کے تمام بنی اسرائیل کے لوگوں نے امن وسلامتی کے ساتھ دریا عبور کرلیا۔ کچھ دیر بعد فرعون اپنے لشکر کے ہمراہ دریائے نیل کے کنارے پہنچ گیا۔ جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تو فرعون سے کہنے لگے کہ دیکھو موسیٰ علیہ السلام

نے ایک نیا معجزہ کر دکھایا ہے۔ فرعون اس حد تک بد بخت اور بے غیرت تھا کہ کہنے لگا کہ ایسی بات نہیں ہے جو تم سوچ رہے ہو میں نے ہی حکم دیا ہے اور دریا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ آؤ ہم ان کا پیچھا کریں۔

فرعون اور اس کے لشکر کا ڈوب جانا

فرعون نے پیش قدمی کی اور اس کا لشکر بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ فرعون گھوڑے پر سوار تھا اور گھوڑا دریا میں جاتے ہوئے خوف سے ہنہنا رہا تھا جبکہ فرعون کو بھی خوف لاحق تھا' لیکن وہ شکست و ناکامی قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک گھوڑی پر سوار ہوئے اور فرعون کے گھوڑے کے آگے آگے چل پڑے۔ جیسے ہی فرعون کے گھوڑے کی گھوڑی پر نگاہ پڑی فرعون کا گھوڑا سرپٹ گھوڑی کے پیچھے دوڑنے لگا اور فرعون کا لشکر بھی فرعون کے پیچھے دریا میں داخل ہو گئے۔ جب فرعون اور اس کا لشکر دریا میں بنے ہوئے راستوں میں مکمل طور پر داخل ہو گئے تو:

فَاَخَذْنٰا هُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ.

"تو ہم نے ان کو اس طرح سخت پکڑا جس طرح ایک زبردست صاحب قدرت پکڑا کرتا ہے۔"

عَزِیْزٍ: یعنی وہ غالب جو کسی صورت میں مغلوب نہ ہو سکے اور خدا کے سوا کوئی بھی عزیز مطلق نہیں ہے۔ دیگر تمام مخلوق خدا کے مقابلے میں ذلیل وضعیف ہے۔ مخلوق پر ضعف' بڑھاپا' بیماری اور موت وغیرہ کی مانند صفات اور عوارض غالب ہو جاتی ہیں صرف اور صرف خدا عزیز و غالب مطلق ہے۔

مُقْتَدِرٍ: کہ معنی ہیں طاقتور اور توانا۔

آل فرعون کو اس طرح پکڑا جس طرح ایک زبردست غالب مطلق اور صاحب قدرت پکڑ کرتا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے پانی کو حکم الٰہی ہوا کہ ایک دوسرے سے مل جائے جونہی دریا میں طغیانی آئی فرعون کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی نجات کی راہ باقی نہیں، اب عذاب الٰہی اسے نظر آ چکا تھا۔

ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ.

''تو کہنے لگا کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں میں بھی اس پر ایمان لاتا ہوں اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں میں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

فرعون نے جب یہ کہا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس کا منہ بند کیا اور فرمایا اب مہلت ختم ہو چکی ہے۔

آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ. (سورۃ یونس۔ ۹۱)

''اب مرنے کے وقت ایمان لاتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کر چکا اور تو تو فسادیوں میں سے تھا۔''

اب جبکہ خدا نے چالیس سال تک تجھے مہلت دی اور تو پہلے خدا بننے کا دعویٰ کرتا رہا ہے اور کہتا رہا تھا۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی: یعنی میں تمہارا سب سے برتر پروردگار ہوں۔ اس سے

پہلے کتنی بار ڈرایا دھمکایا گیا' خدا کی عظیم نشانیاں اور معجزات تو نے دیکھے کتنے عذاب نازل کئے گئے' صرف اسی لئے کہ تو ایمان لے آئے لیکن تیری بغاوت اور سرکشی دن بدن زیادہ ہوتی چلی گئی۔ اب جبکہ تجھے عذاب حتمی نظر آ گیا ہے۔ تو ایمان لانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

فرعون کی صرف زبانی کلامی بات تھی

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ فرعون نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف اور صرف ایک مکارانہ چال تھی اور اگر اسے موت سے نجات مل جاتی تو وہی طریقہ اختیار کرتا جو اس سے قبل کرتا رہا تھا کہ جب وہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو موسیٰ علیہ السلام سے منت سماجت کرتے ہوئے وعدہ کر لیتا تھا لیکن جب اس کو مصیبت سے نجات مل جاتی تھی تو وہ اپنے وعدہ سے پھر جاتا تھا۔

لیکن بعض دیگر مفسرین کا بیان ہے کہ فرعون کی توبہ قبول نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے عذاب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تھااور اس وقت اس نے توبہ کی اور اس قسم کی توبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ قرآن مجید کی صریح اور واشگافتہ آیات مبارکہ کے مطابق جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ اس کی موت قریب الوقوع ہے تو اس کی توبہ قبول کر لی جاتی ہے لیکن اس کے بعد توبہ بے سود ہوتی ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰىٓ اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ

يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُوْلٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا.

(النساء۔۱۷)

''اور توبہ ان لوگوں کے لئے (مفید) نہیں ہے جو (عمر بھر تو) برے کام کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سر پر موت آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں نے توبہ کی اور اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی توبہ (مفید) نہیں ہے جو کفر ہی کی حالت میں مر گئے۔ ایسے ہی لوگوں کے واسطے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

یعنی جب اسے موت نظر آ جائے تو استغفر اللہ کہہ دے اس قسم کی توبہ کا کیا فائدہ ہے جو اضطراراً اور مجبوری کے عالم میں کی جاتی ہے جبکہ اس کے بعد گناہ کے ارتکاب کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی۔

ندامت اور برائیوں کو ترک کرنے کا عزم بالجزم

توبہ کے دو پہلو ہیں گناہ اور برائی کے سلسلے میں۔ نادم ہونا اور آئندہ گناہ اور معصیت برائی نہ کرنے کا عزم۔ اب جب کسی شخص کو یقین ہو جائے کہ وہ مرنے والا ہے تو ایسی صورت میں آئندہ یا مستقبل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے پاس گناہ کرنے یا نہ کرنے کا وقت ہی باقی نہیں رہا۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی قبر میں داخل ہونے کے بعد توبہ کا طالب ہو، اگر اس قسم کی توبہ سے کوئی فائدہ حاصل ہو تو جہنم میں بھی توبہ سے ضرور فائدہ ملے گا۔

اسی طرح فرعون پانی میں ڈوبنے والوں کی صف میں شمار ہو چکا تھا اور اس کا ان سات افراد میں شمار ہوتا ہے جن کو جہنم میں سب سے زیادہ عذاب ہو گا۔

سَبَقَتْ رَحْمَتُهُ غَضَبَهُ

"پروردگار عالم کی رحمت و مہربانی اس کے غضب و قہر پر غالب ہے۔"

پروردگار عالم بڑا مہربان اور رحم والا بھی ہے اور قہار و عزیز ذوانتقام بھی ہے۔ یعنی اس کا انتقام اور غضب کی بنیاد ناتوانی اور کمزوری نہیں بلکہ وہ قادر و عزیز و غالب مطلق ہے اور جو بھی کرتا ہے، عدل و حکمت کی بنا پر کرتا ہے لیکن اس کے باوجود پروردگار عالم کی رحمت و مہربانی اس کے غضب و قہر پر غالب ہے یعنی خدا اپنے بندوں کے ساتھ رحمت و مہربانی سے پیش آتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ. (الانعام . ۱۲)

"اس نے اپنی ذات پر مہربانی لازم کر لی ہے۔"

یعنی خدا نے اپنی ذات پر رحمت و مہربانی واجب کر لی ہے۔ لیکن اگر اس کا بندہ اپنے اختیار کو غلط اور منفی طور پر استعمال کرتا ہے اور کفرانِ نعمت کی راہ اختیار کرلیتا ہے اور ایمان لانے کے بعد اپنے ہی افعال کے سبب قہر الٰہی کا مستحق اور سزا وار ٹھہراتا ہے تو بندہ کے اپنے ہی اختیاری فعل کے باعث خدا اس کے ساتھ قہر و غضب سے پیش آتا ہے۔

خدا فرعون کے ساتھ مسلسل چالیس سال تک حلم و بردباری و رحمت و مہربانی سے پیش آیا، فرعون نے کہا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ میں تمہارا سب سے برتر پروردگار ہوں: خدا نے اس کے باوجود فی الفور اور اچانک اس پر عذاب نازل نہ فرمایا جس کی تفصیل روایات میں نقل کی گئی ہے۔ اب کیونکہ اس نے رحمت و مہلت

الٰہی سے ناجائز فائدہ اٹھایا' اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاَخَذْنٰاهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ.

''تو ہم نے ان کو اس طرح پکڑ لیا جس طرح ایک زبردست صاحب قدرت پکڑتا ہے۔''

اس لئے خدا اسکے ساتھ اپنی عزت و جلالت کی صفت سے پیش آیا۔ رب العالمین ملک الملوک اور قہار و جبار کے مقابلے میں مٹھی بھر خاک کا کیا بس چل سکتا ہے۔ جب وہ ذات اپنی عزیزیت اور قہاریت کے ساتھ اس سے پیش آئے۔

فرعون کو پانی سے باہر پھینک دیا گیا

فرعون لوہے کی زرہ چلا میں ملبوس تھا اور اصولی طور پر اسے دریا کی تہہ میں چلا جانا چاہیے تھا لیکن خدا نے دوسروں کے لئے اسے عبرت بنانے کے لئے اس کے جسم کو پانی سے باہر نکال پھینکا ہے تاکہ بنی اسرائیل جب واپس آئیں تو اس کی لاش کو دیکھ کر عبرت و نصیحت حاصل کریں۔

بنی اسرائیل بھی جب واپس ہوئے' تو اس کے زیورات کو مال غنیمت کے طور پر حاصل کر لیا۔

كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ. (الشعراء . ۵۹)

''اور آخر ہم نے انہیں چیزوں کا مالک بنی اسرائیل کو بنایا۔''

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً. (یونس . ۹۲)

''تو ہم آج تیری روح کو تو نہیں مگر تیرے بدن کو تہہ نشین ہونے سے بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے عبرت کا باعث ہو۔''

اس لئے نام نہاد فرعون اور اس کے ہمنواؤں کا انجام یہی ہوتا ہے' اس لئے دوسروں کو چاہیئے کہ خدا کی جانب سے ملی ہوئی مہلت کی وجہ سے غرور و تکبر کا شکار نہ ہوں اور مال و جاہ و منصب وقبیلہ اور خاندان کے سبب خدا سے غافل نہ ہوں اور اس بات سے ڈرتے رہیں کہ مبادا خدا ان کے ساتھ اپنی صفت عزیزیت سے پیش نہ آئے۔

آل فرعون کا یہ دنیوی عذاب تھا جبکہ قرآن مجید کے متن کے مطابق ان کا برزخی عذاب یہ ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اُدْخِلُوْآ اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ. (المومن. ۴۶)

''اور اب تو قبر میں دوزخ کی آگ ہے کہ وہ لوگ ہر صبح و شام اس کے سامنے لا کھڑے کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت برپا ہو گی حکم ہو گا کہ فرعون کے لوگوں کو سخت سے سخت تر عذاب میں جھونک دو۔''

کیا آپ محفوظ ہیں؟

اَکُفَّارُکُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰئِکُمْ اَمْ لَکُمْ بَرَائَۃٌ فِی الزُّبُرِ.

''اے اہل مکہ کیا ان لوگوں سے بھی تمہارے کفار بڑھ کر ہیں یا تمہارے واسطے پہلی کتابوں میں معافی لکھی ہوئی ہے۔''

پانچوں قصوں کو یعنی نوحؑ اور ان کی قوم کی داستان، عاد و ثمود و لوط علیہم السلام اور فرعون کے اقدام کی داستانیں بیان کرنے کے بعد پروردگار عالم اس مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''اَکُفَّارُکُمْ خَیْرٌ مِّنْ اُولٰئِکُمْ.''

''کیا تمہارے کافر ان لوگوں سے بہتر ہیں؟''

اے وہ لوگو! جن پر حضرت محمدؐ کے نور کی ضوفشانی ہوئی تمہاری ساخت و پیدائش جداگانہ نہیں ہے اور ان لوگوں پر تمہیں کسی قسم کی برتری حاصل نہیں ہے، بلکہ مادی اور دنیوی لحاظ سے وہ لوگ تم سے کہیں زیادہ برتر تھے۔

اگر ظاہری طاقتوں و توانائیوں کو مدنظر رکھا جائے تو جیسا کہ ہم پہلے بیان کر

چکے ہیں کہ قومِ عادؑ اس درجہ طاقتور، دراز قد اور تنومند تھے کہ وہ پہاڑوں کی چٹانوں کو اٹھا کر ان سے اپنے مکان اور ان کی چھتوں کی تعمیر کرتے تھے۔

اور اگر مال و دولت اور جاہ و حشم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو فرعون کے زمانے کا موجودہ دور پر کسی طرح بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ ہم لوگوں سے کہیں زیادہ مال دار اور خوشحال تھے۔

اَمْ لَکُمْ بَرَائَۃٌ فِی الزُّبُرِ.

''یا آسمان اور پہلی کتابوں میں تم عربوں کے لئے معافی لکھی ہوئی ہے اور ضمانت دی گئی ہے کہ قوم عرب کو عذاب نہیں ہوگا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو ایسی صورت میں خوش ہونا چاہئے کہ تمام کی تمام سابقہ کتابوں میں یہ خوشخبری دی گئی ہو کہ عرب قوم سے ہم نے عذاب اٹھا لیا ہے اور انہیں عتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ یہاں پر لفظ ''زبر'' موضوعِ بحث کی تاکید کے لئے جمع کے صیغہ میں استعمال ہوا ہے۔

یہ استفہام انکاری ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے کسی بھی شکل میں معافی نہیں لکھی گئی۔

''اَمْ یَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِیْعٌ مُّنْتَصِرٌ.''

''یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم بہت طاقتور جماعت ہیں۔''

کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اکٹھے ہیں اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں؟

دراصل مشرکین اور کفارِ قریش مکہ گروہ بندی ختم کر کے ختمی مرتبتؐ کی اذیت رسانی پر متفق ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے عرصہ تین سال تک رسول مکرمؐ اور مسلمانوں

سے ہر قسم کے تعلقات ختم کر لئے تھے اور یہ لوگ کہتے تھے کہ ہم ان سے جان لیوا انتقام کے واسطے اکٹھے ہو چکے ہیں۔

"مُنتَصِرٌ." کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم شکست نہ کھانے والا گروہ ہیں کیونکہ ہم آپس میں متحد ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہیں۔

آگے چل کر پروردگار عالم اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ کو وحی فرماتا ہے کہ ان کے دعوے سچے نہیں ہیں اور جو کہہ رہے ہیں اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ.

"عنقریب ہی یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔"

اس آیہ مبارکہ کا قرآن مجید کی غیبی خبروں میں شمار ہوتا ہے کہ پروردگار عالم اپنے رسول کو وحی کے ذریعے خبر دے رہا ہے کہ عنقریب کفارِ قریش کو شکست ہو گی اور وہ لوگ جنہوں نے گروہ بندی کی ہوئی ہے اور خوش فہمی کا شکار ہیں اور ہمارے پیغمبر کے خلاف ان کی جرأت و ہمت میں اضافہ ہو گیا' بہت جلد بکھر جائیں گے۔ اور کفار عرب مسلمانوں کی تلواروں اور قوت کے مقابلے میں پیٹھ پھیر کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔

یہ بات اس سے قبل ناقابل یقین تھی لیکن پروردگار عالم نے وحی کے ذریعے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ کو یہ خوشخبری دی کہ ان کے تمام گروہ مغلوب ہو کر ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہو جائیں گے۔

جنگ بدر

جب حضرت محمد مصطفیؐ کو مدینہ منورہ میں تشریف لائے ہوئے اٹھارہ ماہ گذر گئے تو جنگ بدر کا واقعہ رونما ہوا۔ رسول خدا حضرت محمد مصطفیؐ نے اس آیہ مبارکہ کی تلاوت فرمائی تو مسلمان بھی سمجھ گئے کہ خدا کا وعدہ پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

"بدر" مکہ مکرمہ کے قرب و جوار میں واقعہ ایک کنویں کا نام ہے اور یہ وہی مقام ہے جہاں پر مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان جنگِ بدر واقع ہوئی تھی۔ اس جنگ کا آغاز مشرکین کی جانب سے ہوا تھا کہ ان کے نوسو پچاس (۹۵۰) طاقتور جنگجو افراد نے رسول خداؐ اور آپ کے جانثاروں کیخلاف جنگ کرنے کے لئے لشکر کشی کی۔ اس جنگ کے روزانہ کے اخراجات قریش کے ایک سردار کے ذمے ہوتے تھے۔ قریش کے لوگوں کو اپنی کامیابی پر اس درجہ یقین تھا کہ وہ گانے بجانے والی رقاصاؤں کو آلات موسیقی سمیت میدان جنگ میں اپنے ہمراہ لاتے تھے تا کہ جنگ کے دوران سستی و کاہلی کا شکار نہ ہوں۔

اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مسرت کے شادیانے بجاتے ہوئے چاہ بدر کے قریب آ کر صف آراء ہوگیا۔

دوسری جانب حضور ختمی مرتبت ؐ اپنے جانثار اصحاب کے ہمراہ جن کی تعداد صرف تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی، انتہائی معمولی جنگی سامان لئے بدر کے کنویں کی جانب روانہ ہوئے۔ رسول خدا ؐ اور آپ کے جانثاروں کے پاس صرف ستر ۷۰ اونٹ اور سات تلواریں تھیں۔

چنانچہ جنگی اصولوں کے مطابق آپ ؐ کا مختصر سا لشکر کسی بھی لحاظ سے مشرکین کے جنگی ساز و سامان سے لیس لشکر کے ساتھ قابل موازنہ نہ تھا۔ نیز یہ کہ راستہ قدروں میں ان کے عزم و ہمت بھی کمزور ہو چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں انہیں شدید خوف لاحق ہو گیا تھا۔

باران رحمت

پروردگار عالم نے ان حالات میں مسلمانوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمایا۔ جس مقام پر مسلمانوں کا مختصر سا لشکر صف آرا ہوا تھا وہ ریت سے بھرپور ریگستانی علاقہ تھا۔ مسلمانوں کے پاؤں اس ریت میں دھنس رہے تھے۔ اس موقع پر خدا کے حکم سے یہاں بارش ہونی شروع ہو گئی اور اس طرح ریت گیلی ہو گئی۔ یوں بارش کے نتیجے میں ان کی مشکلات میں کمی اور عزم و استقلال میں اضافہ ہوا۔

اس باران رحمت سے انہیں یہ بھی فائدہ ہوا کہ انہوں نے اپنی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ بارش کے پانی سے غسل کر کے معنوی نجاستوں سے برائت حاصل کی۔

خدا نے اس موقع نازل ہونے والی پہلی باران رحمت کا ذکر قرآن مجید کے سورۂ انفال میں یوں فرمایا ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَآءِ

مَاءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ

عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتُ بِهِ الْاَقْدَامَ. (الانفال. ۱۱)

''یہ وہ وقت تھا جب اپنی طرف سے اطمینان کے لئے تم پر نیند

کو غالب کیا جا رہا تھا، اور تم پر آسمان سے پانی برس رہا تھا کہ

تمہیں پاک و پاکیزہ کر دے اور تم سے شیطان کا رجس دور ہو

جائے۔ اور تمہارے دل مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے

پاؤں جمے رہیں۔''

جنگ کا آغاز

ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ ؐ نے مشرکین کے نام ایک پیغام ارسال فرمایا:

اس پیغام میں آپ ؐمشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں تم لوگوں سے جنگ کرنے کا خواہاں نہیں اس لئے آؤ

مصالحت کرلیں۔''

انہوں نے جواب دیا:

نہیں ہم صلح نہیں کریں گے، کیوں کہ ہم آپ ؐ اور آپ ؐ کے پیروکاروں کو

صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔

آخر کار اس گفت وشنید کے بعد جنگ کا آغاز ہوا۔ ایک جانب حضرت علی

علیہ السلام، حضرت حمزہ اور جناب شیبہ اور دوسری جانب عتبہ، ولید اور دوسرے لوگ

مبارزہ طلبی کے لئے آمادہ ہو گئے۔

اس جنگ میں اجمالاً مشرکین کے سرداروں میں سے ستر (۷۰) جنگجو ہلاک

ہوئے اور ستر افراد اسیر ہوئے۔ ان میں سے چھتیس افراد (۳۶) حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں واصل جہنم ہوئے جبکہ باقی افراد ان ملائکہ کی مدد سے جنہیں خدا نے مسلمانوں کی نصرت کے لئے بھیجا تھا' دیگر اصحاب کے ہاتھوں جہنم رسید کئے گئے۔

فرشتوں کی امداد

پروردگار عالم سورۂ انفال ہی میں ارشاد فرماتا ہے۔

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِکَةِ مُرْدِفِیْنَ. (الانفال . ۸)

''یہ وہ وقت تھا' جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سن لی اور جواب دیا کہ میں ہزار فرشتوں سے تمہاری مسلسل مدد کروں گا۔''

ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''میں مشرکین کی صفوں پر ٹوٹ پڑا اور جب میں واپس آیا تو رسول خدا ؐ کو سجدہ کے عالم میں **یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ** کے کلمات ورد کرتے ہوئے پایا۔ دوسری باری پھر لشکر کی صفوں کو چیرتے ہوئے مشرکین پر حملہ کیا اور جب واپس لوٹا تو آپ کو حالت سجدہ میں انہی کلمات کا ورد کرتے ہوئے پایا اور تیسری بار بھی میں نے رسول خدا ؐ کو اسی حالت میں دیکھا۔

ختمی مرتبت ؐ نے

اَللّٰھُمَّ اَجْزِنِیْ مَاوَعَدْتَنِیْ:

''خدایا جس بات کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما دے۔''

کے کلمات کا تین بار ورد فرمایا:

اسلام اور مسلمانوں کے لئے وہ دن انتہائی اہم تھا۔ اگر اس روز مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوتی تو اسلام کا نام ونشان باقی نہ رہتا۔ چنانچہ پروردگار عالم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور خدا نے پانچ ہزار فرشتے جو دو تحت الحنک والے عمامے پہنے ہوئے تھے مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیجے۔ پروردگار عالم اس نصرت اور امداد غیبی کے بارے میں قرآن مجید کی سورۂ آل عمران کی آیت ۱۲۴ میں فرماتا ہے:

بَلٰی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاتُوْكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ.

(آل عمران: ۱۲۴)

''بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو اور رسول کی مخالفت سے بچو اور کفار اپنے جوش میں تم پر چڑھ بھی آئیں' تو تمہارا پروردگار ایسے پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا' جو نشان جنگ لگائے ہوئے ڈٹے ہونگے۔''

جنگ کے دوران جو کفار فرشتوں کے ہاتھوں ہلاک ہوتے تھے ان کی علامت یہ تھی کہ اُن کا خون نہیں بہتا تھا۔ جبکہ بعض کفار جو فرشتوں کے ذریعے ہلاک ہوئے تھے ان کے بازو لکڑی کی مانند خشک ہو چکے تھے۔

ابوجہل کی ہلاکت

اس جنگ میں حضور ختمی مرتبت ؐ کا شدید ترین دشمن اور آپ ؐ سے انتہائی درجہ کا عناد رکھنے والا ابوجہل بھی ہلاک ہو گیا۔ دو مسلمانوں نے اس موقع پر یہ کہا کہ آج کا دن وہ دن ہے کہ خدا اور رسول خدا ؐ سے سب سے زیادہ عناد رکھنے والے کو بھی ہلاک کیا جائے گا۔ ابوجہل یہ بات سنتے ہی میدان جنگ میں آیا اور مذکورہ دو مسلمانوں نے اسے بھانپ لیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ ابوجہل بھی دفاع کے لئے تیار ہوا لیکن آخر کار ابوجہل کی ٹانگ پر ان دو مسلمانوں میں سے ایک کی تلوار کی ضرب لگی۔ جس سے اس کی ٹانگ کٹ گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ ابوجہل کا بیٹا اس کی مدد کے لئے آگے بڑھا اور اس نے مسلمان کا بازو قلم کر دیا۔ لیکن اس پر بھی اس مسلمان کو بہت مسرت تھی کہ اس نے ابوجہل کا خاتمہ کر دیا ہے۔ بریدہ لات ابوجہل گھوڑوں کی ٹاپوں اور لشکریوں کے قدموں تلے روندا گیا۔ اس کو اتنا ذلیل وخوار ہونا پڑا۔

آئندہ روز رسول خدا حضرت محمد ؐ نے فرمایا:

ہے کوئی شخص جو ابوجہل کے بارے میں ہمارے لئے خبر لا سکتا ہے؟

عبداللہ بن مسعود نے حضور پاک ؐ سے اجازت طلب کی تا کہ جا کر اس امر کے بارے میں تحقیق کرے۔ آپ ؐ نے اسے اجازت دے دی۔ انہوں نے دوسروں سے اس کی شناخت کی نشانیوں کا پتہ چلایا۔ انجام کار ابوجہل عبداللہ بن مسعود کو ہلاک ہونے والوں میں ملا، تاہم وہ ابھی زندہ تھا۔

ابن مسعود کو بہت مسرت ہوئی کہ اس بدترین کافر کے سر کو اس کے جسم سے علیحدہ کروں گا۔ ابن مسعود ابوجہل کے سینہ پر سوار ہوا تو ابوجہل نے کہا:

''کہ اے گڈریے تو ایک بلند مقام پر بیٹھا ہے اور بہت عظیم کام کرنے آیا ہے۔ (یعنی تو مکہ کے بہترین اور بڑے سردار کو قتل کرنے آیا ہے۔) لیکن یہ تو بتا کہ آخر کار فتح کسے نصیب ہوئی؟''

ابن مسعود نے جواب دیا کہ خدا اور اس کے رسول کو فتح حاصل ہوئی ہے۔

پھر فرمایا:

:اے ملعون اور فرعون سے بدتر شخص!! اس نے تو اپنی آخری سانسوں میں کہا تھا کہ میں ایمان لے آیا ہوں لیکن تو ابھی تک اپنے کفر پر باقی ہے؟!

ابوجہل نے جواب دیا:

''اب میری دشمنی اور عناد پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔''

ابن مسعود ابوجہل کا سر تن سے جدا کرنے ہی والے تھے کہ وہ کہنے لگا:

''میری چھاتی سے بھی کچھ حصہ کاٹ لے تا کہ میرا سر زیادہ بڑا محسوس ہو''

بے شک وہ واقعی ابوجہل تھا۔ ابن مسعود نے اپنے کند اور پرانے خنجر سے ابوجہل کے سر کو کاٹنے کی کوشش کی، لیکن تمام تر کوشش کے باوجود وہ اس کا سر تن سے جدا نہ کر سکا۔ آخر اسی کی تلوار سے اس کے منحوس سر کو اس کی خواہش کے برعکس تن سے جدا کیا۔ یعنی ابن مسعود نے گردن کے اوپر کا حصہ کاٹا تا کہ اس کا سر دوسروں کے سروں کے مقابلے میں چھوٹا نظر آئے اور اسے کھینچتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں لے آیا۔

رسول خداؐ سجدۂ شکر بجا لائے کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کی راہ سے ایک خطرناک کانٹا صاف کر دیا گیا تھا۔ بے شک خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا یعنی ''سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ.'' اس طرح بہت جلد مشرکین کو شکست فاش ہوئی اور ان کا متحدہ لشکر پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگ نکلا۔

اس جنگ ''جنگ بدر'' میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' کفار کے ستر (۷۰) افراد ہلاک ہوئے اور ستر (۷۰) افراد مسلمانوں نے قیدی بنا لئے۔

حضرت عباسؓ کا مشرف بہ اسلام ہونا

ان اسیروں میں حضرت عباس بن عبدالمطلب (حضور پاکؐ کے چچا) بھی شامل تھے۔ تمام اسیروں کی گردنیں ایک رسی میں بندھی ہوئی تھیں۔ جو افراد کل تک اپنے آپ کو انتہائی طاقتور اور سورما سمجھتے تھے اور سرکش تھے اب مسلمانوں کی قید میں آ چکے تھے۔

رات کے وقت رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰؐ نے آہ و بکا کی آواز سنی۔ آپؐ نے اس آہ و بکا کا سبب دریافت کیا' تو اصحاب نے جواب دیا کہ اسیروں کی رسی مضبوطی سے باندھی گئی ہے۔ اس لئے انہیں اس سے تکلیف ہو رہی ہے۔ حضور پاکؐ نے فرمایا: اسیروں کی گردنوں میں بندھی ہوئی رسی کو ڈھیلا کر دو۔ دوسرے دن جب اسیروں کو رسول خداؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضورؐ عباس کو دیکھ کر مسکرائے۔ عباس نے کہا: کیا آپؐ مذاق اور تمسخر کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں بلکہ میری مسکراہٹ کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں زبردستی جکڑ کر جنت میں لے جانا چاہتے ہیں۔

بہر حال انہوں نے عہد کیا کہ وہ فدیہ ادا کریں گے اور جیسا کہ طبرسی کی روایت حیاۃ القلوب میں منقول ہے مشرکین کا مجموعی فدیہ چار ہزار درہم یا ایک ہزار درہم تھا۔ چنانچہ قریش کے لوگ تدریجی طور پر فدیہ کی رقم ادا کرتے رہے اور اپنے اسیروں کو رہا کراتے گئے۔

کیا حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا رحم کی سزاوار نہ تھیں

اس مقام پر ابن ابی الحدید معتزلی کا ایک بیان منقول ہے جس کا یہاں پر ذکر کرنا ضروری ہے اس بیان کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

''ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہ زہراؑ سلام اللہ علیہا کے سلسلے میں کسی حد تک شدید رویہ اختیار کیا۔ اگر وہ باغ فدک کو حضرت ختمی مرتبتؐ کی خوشنودی کے واسطے حضرت زہراؑ کے حوالے کر دیتے اور ان کی راہ میں رکاوٹیں نہ ڈالتے تو ان کا کیا بگڑتا۔ کیا جمہور مسلمان اس بات پر معترض ہو سکتے تھے۔''

ابن ابی الحدید معتزلی جو سنی المسلک ہے یہ بات بیان کرنا چاہتا ہے کہ یہ دونوں افراد بدنصیب تھے' کیونکہ وہ ایسا نیک کام نہ کر سکے۔ لیکن آپ تو خوب واقف ہیں کہ اصل موضوع کیا ہے؟ اس سلسلے میں مزید معلومات اور تفصیلات کے لئے حضرت آیت اللہ دستغیب کی کتاب صدیقۃ الکبریٰ میں فدک کی مختصر تاریخ کے باب کا مطالعہ کریں۔

دراصل ان لوگوں کی دشمنی وخصومت اور عناد اور فریب پر مبنی سیاست آڑے آئی۔ اسی لئے انہوں نے حضرت زہراؑ' کو ان کے مسلمہ حق سے محروم کر دیا۔ جبکہ اگر وہ سیرت نبویؐ کے مطابق عمل کرتے تو بفرض محال اگر فدک حضرت زہراؑ سلام اللہ علیہا کا مسلمہ حق نہ بھی ہوتا تو اسے بہتر انداز میں حضرت زہراؑ کو ہبہ کیا جا سکتا تھا۔ اور یقیناً کوئی بھی مسلمان اس بارے میں کسی قسم کا اعتراض نہ کرتا۔

سیدۃ نساء العالمین سارے جہانوں کی عورتوں کی سردار

وَمَنْ آذاھا فَقَدْ آذانِیْ وَمَنْ آذانِیْ فَقَدْ آذَی اللّٰہ.

''یعنی جس نے اسے اذیت و تکلیف دی، اس نے درحقیقت مجھے اذیت و تکلیف دی۔ اور جس نے مجھے تکلیف دی گویا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچائی۔''

کیا یہ حدیث حضور پاکؐ نے بیان نہیں فرمائی تھی؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ بلکہ حضرت زہراء علیہا السلام کے بارے میں ایسے بیانات اور اس سے ملتے جلتے بیانات آپؐ نے متعدد بار فرمائے ہیں۔

کفار کے وعدے کا وقت قیامت ہے

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ وَاَمَرُّ اَدْهٰی.

"بات یہ ہے کہ ان کے وعدے کا وقت قیامت ہے اور قیامت بڑی سخت اور بہت تلخ (چیز) ہے۔"

جو افراد مشرکین میں سے ہلاک ہو گئے ہیں، یہ نہ سمجھیں کہ ان کی سزا پوری ہو گئی ہے۔ ان کے اعمال کی سزا اور اس کا نتیجہ صرف ان کی ہلاکت ہی نہیں ہے۔ دنیوی زندگی میں ان لوگوں سے کیا گیا سزا کا وعدہ تو قیامت کے دن پورا ہوگا۔ نیز یہ کہ اگر وہ ہلاک ہوتے ہیں یا قید و بند کی صعوبتیں کاٹتے ہیں تو یہ جہنم کی سزاؤں کا ایک ادنی سا نمونہ ہے۔ اس لئے کہ کفار کی سزا کا وعدہ قیامت کے روز پورا کیا جائے گا۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ لفظ مَوْعِدُهُمْ میں جو هُمْ کی ضمیر استعمال ہوئی ہے، اس سے یہ وعدہ گزشتہ اور سابقہ اقوام پر عائد ہوتا ہے۔ یعنی نوح علیہ السلام عاد ثمود اور لوط علیہم السلام اور فرعون کی اقوام نیز مشرکین قریش، ان تمام کے افراد کے عذاب کا اصل وعدہ قیامت کے دن پورا کیا جائے گا۔

دنیوی زندگی میں انتقام کی آخری حد قتل ہے۔ حالانکہ مجرموں کے جرائم کے

مقابلے میں یہ سزا کوئی بڑی سزا شمار نہیں ہوتی۔ یہ تو عالم اسباب کا انتقام ہے جبکہ حقیقی انتقام اور سزا و عذاب کا مقام وہ جگہ ہے جہاں گنہگار کو جس قدر بھی عذاب ہوگا اسے موت نہیں آئے گی اور اس کے جسم سے جتنی بھی کھال جل کر گل جائے گی، اس کی جگہ خدا پھر نئی کھال پیدا فرما دے گا۔ اور اس امر کی جانب قرآن مجید میں واشگاف الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ. (النساء۔۵٦)

"اور جب ان کی کھالیں جل کر گل جائیں گی تو ہم ان کے لئے دوسری کھالیں پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ اچھی طرح عذاب کا مزہ چکھیں۔"

گویا انہیں اس قسم کا مضبوط جسم دیا جائے گا کہ جو ان شدید عذابوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو۔ اس مقام پر سخت چیزوں کے لئے پتھر کی مثال دی جاتی ہے۔ کافر کا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خدا ارشاد فرماتا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ. (البقرہ:۷۴)

"اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے پس وہ مثل پتھر کے سخت تھے یا اس سے بھی زیادہ، کیونکہ پتھروں میں تو بعض ایسے ہوتے

ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں۔..........................."

بعض افراد اس قدر شقی القلب اور سنگدل تھے کہ بفرضِ محال اگر وہ افراد زندہ ہو جائیں اور دنیا و آخرت کے تمام حالات ان کے سامنے بیان کئے جائیں۔" تو یہ ان سنگ دل افراد پر اثر انداز نہیں ہوتا' یہاں تک کہ وہ اہل ایمان کے بیانات کو سن کر کسی پریشانی سے دوچار بھی نہیں ہوتے اور ان کو کسی قسم کی افسردگی بھی نہیں ہوتی۔ یقینی طور پر پروردگار عالم کافر کو دنیوی زندگی میں کسی بھی مشکل حالات سے دوچار نہ فرماتا' اگر وہ یہ فیصلہ فرمالیتا کہ ہر قسم کی دشواریاں اور تکالیف مومن ہی کے لئے مخصوص کردی گئی ہیں اس طرح کافر کو زندگی میں کوئی مشکل پیش نہ آتی لیکن مومن کو اس بات سے اذیت اور تکلیف لاحق ہوتی۔ لہٰذا عالم آخرت کے عذاب سے متعلق پروردگار عالم ان پر تادیبی پہلو اجاگر کرنے کے لئے انہیں دنیا میں بھی کبھی کبھار سختیوں اور مشکلات کا شکار فرماتا رہتا ہے۔

پروردگار عالم سورۂ زخرف میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِــُٔوْنَ وَزُخْرُفًا وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ. وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ. (الزخرف: ۳۳٬۳۶)

"اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی جماعت ہو جائیں گے

تو جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں
چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ اور
ان لوگوں کے گھروں کے دروازے بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ
لگاتے ہیں اور تجمل و آرائش کرتے ہیں اور یہ سب دنیا کی زندگی
کا تھوڑا سا سامان ہے اور آخرت تو تمہارے پروردگار کے نزدیک
ایسے پرہیزگاروں کے لئے رہے۔ اور جو کوئی خدا کی یاد سے
آنکھیں بند کر لے یعنی تغافل کرے، ہم اس پر ایک شیطان مقرر
کر دیتے ہیں اور وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔''

لہٰذا دنیوی زندگی کافر سے انتقام لینے کے لئے وجود میں نہیں آئی اور اگر کسی کافر کو اس دنیا میں کسی سزا یا تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ دراصل سزا صرف ایک مثال یا نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ اصل عذاب آخرت میں ہوگا۔

قیامت کا عذاب شدید تر ہوگا

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰی وَاَمَرُّ.

''اور قیامت تو بڑی تلخ اور بہت سخت ہے۔''

یہاں پر تاکید اور زور دے کر کہا جا رہا ہے کہ قیامت کا دن بہت سخت اور بڑا تلخ ہے ہر وہ بات یا خوفناک مسئلہ جس میں کوئی راہِ فرار یا نجات باقی نہ ہو اسے داھیہ کہتے ہیں اور لفظ 'ادھیٰ' بوزن افعل صیغہ اسم تفضیل ہے جس کے معنی ہیں وہ مشکل کربناک گھڑی یا شدید عذاب جس سے نجات کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہوں۔ دنیا میں بعض اوقات ایسے مقامات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے جبکہ قیامت اس سے بدرجہا مشکل تر

اور دشوار تر ہولنا کیوں کی حامل ہے۔ اگر کوئی قیامت کے عذاب کی لپیٹ میں آ جائے تو وہ دنیا کی شدید تر پریشانیوں اور مسئلوں کو بھی بھول جائے گا۔ بعینہ جیسے کسی شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہو تو مچھر کا کاٹنا اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

حقوق کے طلبگار اور قیامت کے دن

آپ نے قرآن مجید میں قیامت کے دن کی ''داھیوں'' (حل نہ ہونے والی مشکل اور پریشانی) کے بارے میں بار بار مطالعہ کیا ہوگا۔ قیامت کا دن وہ دن ہے جب ہر شخص کو اتنا بلند کیا جائے گا کہ میدان قیامت میں موجود ہر شخص اسے دیکھ سکے گا۔ ادھر ندا سنائی دے گی کہ جس کا بھی اس شخص پر کوئی حق ہے وہ حاضر ہو۔ چنانچہ اپنے اپنے حقوق کے طالبین اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض ایسے افراد بھی ہونگے کہ جن کے بارے میں حق نہ دینے والے شخص کو یاد بھی نہ ہوگا کہ میں نے ان کے حقوق ادا نہیں کئے تھے۔ چنانچہ اگر اس نے کسی کی بے حرمتی یا رسوائی کی ہوگی، کسی کی چغل خوری یا غیبت کی ہوگی، کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا یا کسی کا قرضہ دینا ہوگا اور وہ اسے یاد نہ رہا ہو تو ہر ہر فرد اس شخص سے اپنے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا۔

کتنی بد نصیبی ہے کہ اس مجبور و لاچار کو اس کسمپرسی کے عالم میں اپنی نیکیوں میں سے ان حقوق کی ادائیگی کرنی ہوگی۔

روایات کے مطابق بیان کیا گیا ہے کہ ایک درہم مال کا بدلہ قبول شدہ نماز کی سات سو (۷۰۰) رکعتیں اس شخص کو دینی ہونگی؟ اب آپ ہی بتائیے کہ اس سے بڑھ کر کونسی مصیبت اور ''داہیہ'' ہو سکتی ہے؟ اب اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں تو اسے صاحب حق کے گناہوں میں سے گناہ لے کر اپنے گناہوں میں شامل کرنا ہوگا، تاکہ

صاحب حق کے گناہوں کے وزن کو کم کیا جا سکے۔

اَمَـرَ : لفظ مُـرُ یعنی تلخ یا کڑوا سے ماخوذ ہے۔ اور اَمَـرُ کا معنی تلخ تر یعنی انتہائی کڑوا ہے۔ لہٰذا اس دنیا میں کوئی چیز بھی خوش آئند نہیں اور مزاج پر گراں گزرتی ہے، قیامت کے دن اس کی ناگواری، تلخی اور کڑواہٹ اس درجہ ہوگی کہ بھائی اپنے بھائی سے اور بیٹا اپنے اپنے ماں باپ سے، بیوی اپنے شوہر سے اور شوہر اپنی بیوی سے دامن تہی اور فرار اختیار کریں گے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے اپنے حق کا مطالبہ کرنے پر اتر آئیں۔

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ.

(عبس: ۳۴-۳۶)

''اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے۔''

اعضاء گواہی دینگے

قیامت کے دن انسان کے تمام اعضاء اس کے خلاف گواہی دینگے، جو کہ انہوں نے کیا ہوگا وہ سب کچھ بتا دینگے۔ قرآن مجید کی اس سلسلہ میں نص موجود ہے:

یَّومَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ. (النور-۲۴)

''یعنی قیامت کے روز ان کی زبانیں ہاتھ اور پاؤں سب، ان کے کاموں کی گواہی دیں گے۔''

''وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ

اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۔(السجدہ:۲۱)

''اور وہ اپنی چمڑیوں (یعنی اعضاء) سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں کر شہادت دی تو وہ کہیں گے کہ جس خالق نے سب چیزوں کو نطق بخشا اسی نے ہم کو گویائی دی۔''

گمراہی اور دوزخ مجرموں اور گنہگاروں کے لئے ہیں

''اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ۔

''بیشک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں مبتلا ہونگے۔''

اگر چہ مُـجۡـرِمۡ: کا لغوی مفہوم گنہگار ہے لیکن اس سے قبل آیات کے سیاق و سباق کے مطابق اس سے مراد مشرک ہے۔ یعنی مشرک لوگ خدا کی جانب سے گمراہی کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔''فِـیۡ ضَلٰلٍ مِـنَ الۡـحَقِّ حق کی جانب سے گمراہی میں ہیں۔ ان لوگوں کی دنیا میں ہر قسم کی حرکات وسکنات اور بودو باش بدنظمی کا شکار ہیں۔ یعنی یہ لوگ اپنی ذاتی خواہشات کے گرد گھومتے ہیں اور کوئی مثبت یا اچھا عمل ان سے واقع نہیں ہوتا کہ جس کے ذریعے وہ ارتقائی مدارج طے کر پائیں۔ ان کی تمام تر سوچ و بچار مال کا حصول و جاہ طلبی اور دنیوی شہرت وسلطنت کے لئے ہے۔ جو قدرتی طور پر خدائی صحیح راستہ سے بھٹک جانے پر منتج ہوتی ہے۔

سَـعَـرۡ: کے معنی ہیں بھڑکائی ہوئی آگ۔ اب چونکہ یہ لوگ دار فانی یعنی دنیا میں حرص، بخل اور دل کی دیگر تمام بیماریوں کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اس لئے روز قیامت بھی بھڑکتی ہوئی آگ ان کا ٹھکانہ ہوگی۔

سَعَرُ: کا دوسرا مطلب ''جُنُوۡنٌ'' ہے اور عین ممکن ہے کہ ضَلَالٌ وَسَعۡرٌ

دونوں ہی دنیوی زندگی کے مظاہر ہوں۔ اس طرح جنوں کا یہ مفہوم ہو کہ مشرکین جو گمراہی راہ اختیار کئے ہوئے ہیں دراصل دیوانے ہیں۔

بحار الانوار میں حضور ختمی مرتبت ؐ سے ایک روایت منقول ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک دن رسول خدا ؐ کا ایک دیوانے سے آمنا سامنا ہوا ہے۔ آپ ؐ نے اس کی باز پرسی کی تو لوگوں ے کہا کہ یہ دیوانہ ہے۔ جواب میں حضور ختمی مرتبت ؐ نے فرمایا: یہ بیماری میں مبتلا ہے یہ ایک عارضے کا شکار ہے اور مصیبت زدہ فرد ہے۔ اس کے بعد آپ ؐ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمَجْنُوْنَ مَنْ اٰثَرَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ.

''یقیناً مجنون اور پاگل وہ شخص ہے جس نے دنیا کو آخرت پر فوقیت دی۔''

نجات کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں

ضَلٰال وسَعَر کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ دونوں سے آخرت کے بارے میں اشارہ ملتا ہو۔ قیامت کے روز مشرکین جنت کے راستے سے گمراہ اور نابلد ہونگے۔ اور انہیں اس راستے کا علم نہ ہوگا۔ جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے:

فَضُرِبَ بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ لَّہٗ بَابٌ بَاطِنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَظَاھِرُہٗ o مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ (الحدید:۱۳)

''پھر ان کے بیچ ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا جس کی اندرونی جانب رحمت اور بیرونی جانب عذاب واذیت ہوگی۔''

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ

''اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔''

قیامت کا دن وہ دن ہے جب گنہگاروں' خطا کاروں اور مجرموں کو منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے دوزخ میں لے جائیں گے اور وہ دوزخ کی آگ میں پھینک دیئے جائیں گے کیونکہ دنیا میں ان لوگوں نے خدا سے روگردانی کی ہوئی تھی۔ اس لئے روز قیامت انہیں دوزخ کے دروازوں سے اس کی آگ میں جھونکا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا:

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَر.

''اب سقر کی آگ کا مزہ چکھو۔''

سَقَرَ: دوزخ کا ایک نام ہے اس سلسلے میں صادق آل محمد علیہ السلام سے مروی ہے کہ ''جہنم میں ایک میدان ہے جس کا نام سَقَرَ ہے۔''

ایک اور روایت میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''سَقَرَ جہنم کی ایک منزل ہے۔'' سقر نے ایک بار خدا سے پھنکارنے کی درخواست کی' جب سقر کو اجازت ملی تو سقر نے پھنکارا اور اس نے تمام دوزخ کو آگ لگا دی۔ یہ باتیں قصے اور دیومالائی کہانیاں نہیں ہیں' وہ حقیقتیں ہیں جنہیں ہمارے ضمیروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دینا چاہئے۔ ہم اس قسم کے خطرناک مراحل اور مواقف حالات کے بارے میں کس وقت سوچ و بچار کریں گے' تاکہ ہمارے دل کو سلامتی و اطمینان نصیب ہوسکیں۔ اور موت کی غشی کے عالم میں رحمت کے فرشتوں کی زیارت سے ہماری آنکھیں منور ہوں۔ اگر موت کی گھڑی میں ہم نے رحمت کے ملائکہ کا مشاہدہ نہ کیا اور ندائے حق ہمیں سنائی نہ دی تو ہمیں جنت میں داخل

ہونے کی دعوت کون دے گا؟

یَآاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ. (الفجر:۲۷۔۳۰)

''اے اطمینان پانے والی روح اپنے پروردگار عالم کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے تو میرے ممتاز بندوں میں اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔''

ہمیں کاہلی اور تساہل پسندی سے کام نہیں لینا چاہئے ایسا نہ ہو کہ ہم ایمان کی سلامتی کے بغیر دنیا سے کوچ کر جائیں یا توبہ کئے بغیر موت کی آغوش میں چلے جائیں۔ کیا اس بات کا کسی بھی شخص کو یقین ہے کہ اس کی موت بہترین اعمال کے وقت واقع ہوگی؟

یہ آتش جہنم کی طرف جا رہے ہیں

دوزخ میں جانے والے لوگوں کے بارے میں ایک حدیث مبارک بیان کی جارہی ہے تاکہ بولنے والا اور سننے والا اپنے انجام کے بارے میں فکرمند ہو سکے۔

کچھ گروہ ایسے ہیں جنہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ پہلا گروہ وہ ہے جس کا حساب ومؤاخذہ کیا جائے گا۔ ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تمام عمر حصول علم میں گزار دی۔ جب ان سے بازپرس ہوگی کہ جو عقل وشعور خدا نے تمہیں عطا فرمایا تھا اس کو بروئے کار لاتے ہوئے تم کونسا عمل بجالائے ہو؟ تو یہ لوگ کہیں گے:

''پروردگار عالم تیری ذاتِ عالم مطلق ہے، کہ ہم راتوں کو بیدار رہے، علوم کی ترویج کی، مطالعہ کیا اور تعلیم حاصل کی، دوسروں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا اور کتابیں تصنیف کیں۔

اس گروہ کو جواب دیا جائے گا کہ یہ تمام کام جو تم نے انجام دیئے ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ تمہیں عالم، تعلیم یافتہ اور صاحب فضیلت کہیں۔ یا مثال کے طور پر تمہیں آیت اللہ اور کا لقب نصیب ہو جائے) تو یہ درجہ تو تمہیں کو حاصل ہو گیا ہے۔

الغرض یہ عالم عمر کے ایک طویل عرصہ تک یہ خیال کرتا رہا کہ میں دینی عالم ہوں اور میرے قلم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے افضل ہے۔ چونکہ

مِدَادُ الْعُلَمَاءِ اَفْضَلُ مِنْ دِمَاءِ الشُّهَدَاءِ.

لیکن یہ بیچارہ اور نادان عالم اس بات سے بے خبر تھا کہ تو اپنی خواہشات نفسانی کی بندگی ہی میں وقت گذارتا رہا ہے۔"

لہٰذا خدا کا حکم جاری ہوگا کہ اسے دوزخ کے حوالے کر دو کیونکہ یہ عالم ریا کار ہے۔

دوزخ میں جانے والے قاریان قرآن

ایک اور گروہ کو لایا جائے گا یہ گروہ قاریانِ قرآن یعنی قرآن مجید کی تلاوت کرنے والوں پر مشتمل ہوگا۔ اس گروہ سے بھی کہا جائے گا کہ تم لوگ اس لئے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے کہ سننے والے یہ کہیں قرآن کی خوب تلاوت کرتے ہیں۔ چنانچہ تمہاری جو خواہش نفسانی تھی وہ تمہاری منشاء کے مطابق پوری ہو گئی ہے اور خدا پر اب تمہارا کوئی اجر باقی نہیں ہے۔ اس طرح اس گروہ کو بھی دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

خَسِرَ الدُّنیَا وَ الْاٰخِرَۃَ

"دنیا و آخرت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

تیسرا گروہ ان شہیدوں کا ہے جنہوں نے اپنے خیال کے مطابق خدا کی راہ میں اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔ اس گروہ کے لوگوں سے کہا جائے گا کہ خدا تمہاری نیت

سے واقف تھا۔ میدان جنگ میں جانے کا تمہارا ہدف یہ تھا کہ تمہیں داد شجاعت ملے اور لوگ تمہیں کہیں کہ تم بہت جری، طاقتور اور سورما تھے۔ تو لوگوں نے تمہیں انہی القاب سے نوازا اور تم اپنا مقصود پا گئے۔ اس گروہ کو بھی جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔

ریا کار صاحبان امارت

چوتھا گروہ وہ ہے جنہوں نے نیکی کی راہ میں مال و زر انفاق کیا۔ لوگوں کو بارگاہ الٰہی میں حاضر کیا جائے گا تو وہ زبان حال سے کہیں گے:

"پروردگار! تجھے اس بات کا علم ہے کہ ہم فقیر اور نادان لوگوں کو کھانا کھلاتے، اور انہیں سیر کرتے تھے اور ان کے جسموں کو لباس سے ڈھانپتے تھے۔ ہم نے مساجد کی تعمیر کی، پانی ذخیرہ کرنے کے لئے ہم خصوصی انتظامات کئے، دینی مدارس تعمیر کروائے اور وقف املاک اور رفائی ادارے وجود میں لائے۔"

پروردگار عالم کی ندا آئے گی:

"تم لوگ جو کچھ بھی بیان کر رہے ہو وہ سچ ہے لیکن تمہارا مقصد تو یہ تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص بہت سخی، نیک اور مخیّر انسان ہے اور اس کا ہاتھ کھلا ہے جس طرح فی زمانہ اخباروں میں تشہیر کی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے زلزلہ اور سیلاب سے متاثرین کے لئے اتنی خطیر رقم کی امداد پیش کی ہے چنانچہ تمہیں اپنی خواہش کے مطابق منزلِ مقصود حاصل ہو گئی۔ لہٰذا اس گروہ کو بھی دوزخ کے حوالے کر دو۔"

اس کے باوجود رحمت کے دروازے بند نہیں

کیا ہمیں اپنے بارے میں کوئی بے لوث اور خالص عمل نظر آتا ہے جس میں کسی قسم کی ریا کاری کا عمل دخل نہ ہو؟ اگر نہیں ہے تو ہم مختلف عذابوں کو اپنی ذات سے دور کیوں سمجھتے ہیں لیکن یاد رکھیں کہ روایت کے مطابق ریا کاروں اور دکھاوے کے طور پر نیکیاں انجام دینے والوں کے ہاتھ، چہرے اور زبان بھی آتش جہنم سے رہائی پا جائیں گے۔

جہنم کا داروغہ ان لوگوں سے فرمائے گا:

"تم کون لوگ ہو کہ پروردگار عالم نے تم پر اس درجہ رحمت و مہربانی فرمائی ہے؟"

لوگ جواب میں کہیں گے:

"ہم ختم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کی امت ہیں لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم ریا کار ہیں۔"

ارشاد پروردگار ہوگا:

"کیونکہ ان لوگوں نے اپنی زبانوں سے میرا ذکر کیا ہے، اور اپنی ان پیشانیوں کو خاک پر میرے سامنے سجدوں میں رکھا ہے اگرچہ ریا کاری کرتے رہے لیکن اس کے باوجود خدا کی رحمت، لطف و کرم اور مہربانی ان کے شامل حال ہو جائے گی۔ اور آخر کار یہی مجازی اعمال جس ترتیب کے ساتھ بجا لاتے رہے ہیں ان کے لئے مؤثر ثابت ہوں گئے۔

حکمت الٰہی ہر چیز میں موجود ہے

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاہُ بِقَدَرٍ.

پروردگار عالم، مشرکین پر عذاب کا بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ ان کے لئے اس عذاب دنیاوی (جو بہت ہی کم ہے) کے علاوہ عذاب آخرت بھی ہے۔ ان کو قیامت کے دن جہنم میں منہ کے بل ڈالا جائے گا اور ان کو کہا جائے گا کہ اب عذاب جہنم کا مزا چکھو۔

یہاں اہل ایمان کی توجہ کے لیے ارشاد فرمایا کہ عذاب الٰہی عدل کی بناء پر ہے، تا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ اس چند روزہ دنیا میں ایمان نہ لانے والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب کیوں ہو؟ یہ تو ظلم ہے؟ تو اس آیت میں اس اعتراض کو دور کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

کہ یہ ظلم نہیں بلکہ عین عدل اور حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کیونکہ ہم نے ہر چیز کو اپنے اندازے سے پیدا کیا ہے "قدر" کے دو معنی ہیں، ایک بمعی مقدار اور حد معین ہے کہ اللہ نے عرش سے فرش تک ہر شئے کو اس حد معین پر پیدا کیا جو حکمت الٰہی کا تقاضا تھا۔ فرشتے سے ملکوت تک سب کو عدل محیط ہے۔ جس چیز کو جو ضرورت تھی وہ عطاء کر دی

گئی ہے۔ ابن عباس کی تفسیر میں ہے کہ اللہ نے اپنی رحمت رحمانیہ سے تمام ضرورتیں عطا فرمائیں۔

ہر چیز اپنے مقام پر

ہر چیز اپنے مقام اور کام پر معین ہے۔ انسانی بدن میں آنکھ دیکھنے کے لیے' کان سننے کے لیے' زبان چکھنے کے لیے ہے وغیرہ وغیرہ' اگر بدن کے اعضاء کم و بیش ہوتے تو کوئی فائدہ نہ تھا۔ یا اگر اپنی جگہ کے علاوہ کہیں اور ہوتے تو بھی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ مثلاً اگر آنکھ سر کے اوپر ہوتی یا پاؤں میں ہوتی تو کیا فائدہ تھا؟ یا اگر سر متحرک نہ ہوتا تو کیا نقص نہ ہوتا؟ اگر بدن کی عمارت میں غور وخوض کیا جائے تو عدل ہی عدل نظر آ رہا ہے۔

آسمانوں کی خلقت کا مشاہدہ

انسان اپنے اوپر کی طرف دیکھے تو چاند' سورج اور ستارے نظر آتے ہیں' اور زمین پر نگاہ دوڑائے تو نباتات' حیوانات اور جمادات نظر آتے ہیں۔ انسان اس خلقت کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کیونکہ ہر چیز اپنے خالق کی نشاندہی کر رہی ہے۔ ہر چیز نے اپنی ضرورت کی مقدار اپنے خالق سے حاصل کی ہے۔ آسمانوں کی گردش' ستاروں کی رفتار' اس طرح دن رات کا کم و بیش ہونا' کائنات کی ہر ہر چیز پر کئی سالوں تک غور وفکر کریں۔ سورج اپنے مخصوص مدار میں چل رہا ہے اور رات کو چاند کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ ان تمام اشیاء سے خدا کی قدرت کاملہ ظاہر ہوتی ہے۔

انا کل شیء خلقناہ بقدر. قدر معین کا معنی وہ اندازہ جو تمام مخلوق کی ضرورت ہے۔ ان کو پیدا کیا۔ اس عالم ملک کی تقدیر جو طبیعت اور دنیا کی طرف ہے تو

یہ عدل الٰہی کا ایک واضح نمونہ ہے۔ **ولقد علمتم الشاۃ الاولی** آپ نے اس دنیا کی پیدائش دیکھی کہ کس طرح عدل کی چادر تانی گئی ہے۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ آخرت میں بھی عدل ہوگا، اگر کوئی جہنم میں جائے گا تو بھی عدل ہے اور اگر وہاں ہمیشہ رہے گا تو بھی عدل ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں محقق علامہ جناب طبرسی فرماتے ہیں ہر شخص کا جہنم میں جانا فضول عمل نہیں ہے بلکہ ایک معین مقدار ہے۔ یعنی ایک شخص ایک سال، دوسرا دس سال حتی کہ کوئی تین سو سال اور کوئی ہمیشہ کے لیے آگ میں جلتا رہے گا۔ ہر شخص اپنے استحقاق کی بنیاد پر اپنے لیے عذاب کی حد معین رکھتا ہے۔

خدائے رحیم نے جہنم کو کیوں پیدا کیا؟

اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ خدا تو قدیر و رحیم ہے، اس کے لئے کیا مانع تھا کہ جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا اور سب کے سب لوگ بہشت میں رہتے؟ یہ سوال حکمت خدا سے بے خبری کی وجہ لئے ہوئے ہے، کیونکہ اگر ایک حاکم وسیع دستر خوان لگوائے اور اس پر مختلف قسم کے کھانے چنوائے اور پھر سب کو دعوت دے کہ آئیں کھائیں۔ اب اگر بعض لوگ اپنے ساتھ کتے اور خنزیر وغیرہ لے آئیں اور تو ان حیوانوں کو دستر خوان پر آنے سے روکنا ان پر ظلم ہرگز نہیں ہوگا بلکہ کتے کو ہڈی، گدھے کو جو اور گوسفند کو چارہ دیا جائے تو کافی ہے، جبکہ ان حیوانوں کو اس دستر خوان پر بٹھا دینا انسانوں پر یقیناً ظلم ہوگا۔

کافر حیوانات سے بھی پست تر ہے

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کفار حیوانوں سے بھی بدتر ہیں (**کالانعام بل هم اضــل**) جن کے دلوں میں نور ایمان روشن نہیں ہوا وہ لوگ تو کتے سے بھی بدتر ہیں۔ تو

ان لوگوں کو اہل ایمان اور حکماء کے ساتھ کس حکم میں بٹھایا جا سکتا ہے؟ جو لوگ ابھی اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے سے نابینا اور سننے سے بہرے ہیں ان لوگوں کو مومنین کے ساتھ جگہ دی جائے تو یہ مومنین پر ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے

دوسری بات ہے یہ کہ حیوان' انسانی غذاؤں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا' تو یہ کافر جو حیوان سے بھی پست ہے اس کا ذائقہ بھی مومن کا ذائقہ نہیں کہ ایک جیسی لذت ان کو حاصل ہو۔

مومن کی معیت سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے

امام حسن عسکری سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''اگر فاجر شخص شیعہ کے مقابل ہو تو مومن کی آنکھوں کا نور اس کی آنکھوں سے بینائی ختم کر دیتا ہے۔ یہ بدبخت کافر بہشت پر تو ایمان ہی نہیں رکھتا تھا' دنیا میں مومنین سے دور رہتا تھا۔ تو آخرت میں ان مومنین کے ساتھ بیٹھنے سے بھلا کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے؟

مخصوص آگ

جہنم میں ہر شخص کی اپنی مخصوص آگ ہوگی' دوسروں سے اس کا کوئی رابطہ نہ ہوگا' یعنی ہر شخص اپنی مخصوص آگ میں رہے گا۔ ایسا نہیں ہوگا ایک بڑے گڑھے میں آگ جلا دی جائے گی اور تمام لوگوں کو اس میں ڈال دیا جائے گا۔

اہل بیتؑ سے منقول بعض روایات کا مضمون یہ ہے کہ محبان اہل بیتؑ کو موت سے پہلے مختلف سختیوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر کے پاک کیا جائے گا تا کہ قیامت کے روز ان کو یہ عذاب نہ جھیلنے پڑیں۔

گناہوں کا کفارہ

نعمت پر شکر کرنا

روایات میں ہے کہ ایک مومن کا ایک رات کا بخار اس کے ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ یہ اہل بیتؑ کی برکتیں ہیں' اس لیے مومن کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ کے لیے شکر گزار رہے اور مشکلات پر صبر کرے اور یہ جانتا ہو کہ خدا اس پر جو بھی مشکل یا مصیبت لائے اس کی بھلائی اور مصلحت اسی میں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدر کا پہلا معنی یہ تھا کہ دنیا اور آخرت میں ہر چیز خدا نے اپنے اندازے سے اسی مقدار معین میں بنائی جو اس کے شایان شان تھی۔ ابن عباس سے منقول ہے جَعَلْنَا لِكُلِّ شَيْءٍ شَكَلًا يوافقةٌ وَيُصْلِحُ لَه. یعنی ہم نے ہر شیء کی موافق اور لائق شان شکل مرتب بنائی۔

ہر چیز کی انتہاء ہے

دوسرا معنی جو مفسرین نے کیا "قدر" سے مراد مقررہ مدت ہے' یعنی ہر چیز کی انتہا ہے۔ تمام مرکبات آخر کار ختم ہو جائیں گے' آسمان اور زمین بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ اس وقت ہوگا جب ان کی عمر پوری ہو جائے گی اور قیامت برپا ہو جائے گی۔

تقدیرات معین ہیں

قدر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو قضاء کے بعد ہوتی ہے۔ یعنی تقدیرات جو روز ازل میں موجودات کی خلقت سے پہلے خلق ہوئی ہیں۔ رسول خداؐ سے مروی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے تقدیرات معین فرمائیں صحت، مرض، غربت، عزت، ذلت غرضیکہ تمام چیزیں ازل میں مقدر تھیں۔ جو ہم تک پہنچی ہیں یہ پہلے ہم پر معین کی گئی ہیں۔

تقدیرات حتمی وغیر حتمی (مبرم و معلق)

تقدیرات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حتمی مثلاً کسی مخصوص دن کے مخصوص حصے میں کسی مخصوص شخص کا مرنا، تو اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ جیسے قرآن مجید نے فرمایا کہ جب موت آجائے تو اسے ذرہ بھر آگے پیچھے نہیں کیا جا سکتا، یا کوئی بیماری آ گئی تو یہ حتمی امور ہیں۔

دوسری قسم غیر حتمی یعنی معلق امور برابر ہیں یعنی ممکن ہے کہ یہ تبدیل ہو جائیں۔ مثلاً اگر صدقہ یا صلہ رحمی نہ کی تو مخصوص شخص مخصوص دن میں مر جائے گا یا جیسے فلاں شخص اگر قطع رحمی نہ کرے تو وہ دو سال تک زندہ رہے گا، ممکن ہے کہ قطع رحمی سے اسی سال مرجائے۔

عمل میں کوتاہی نہ ہو

چونکہ ہمیں تقدیر کا کچھ علم نہیں ہوتا اس لئے ہمیں چاہئے کہ دعا اور اعمال میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں، خصوصاً صدقہ دینا تو یہ ایک عمل کیمیا ہے۔ حضرت صادقؑ فرماتے ہیں کہ یہ نہ کہو کہ المقدار کائن یعنی تقدیر ہو گی کیونکہ بعض تقدیرات دعا اور تضرع

سے تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جیسے یونسؑ نبی کی قوم کے سر پر عذاب آ گیا تھا لیکن دعا اور تضرع کی وجہ سے رک گیا۔ حالانکہ پیغمبرؑ نے بد دعا کی تھی اور ان کی بد دعا بھی قبول ہو گئی تھی۔ پس کبھی قضائے مبرم بھی ممکن ہے کہ تبدیل ہو جائے۔

خدا کے لیے معطلی نہیں

جب خدا نے فرمایا کہ ہم نے ہر چیز کو پیدا کرنے سے پہلے تقدیر اور اندازہ معین کیا تو ممکن ہے کہ کسی کو یہ گمان ہو کہ اتنی ساری مخلوق کی کلی اور جزوی تقدیریں لکھی ہوں۔ اور اس کے لئے کوئی طولانی عرصہ لگا ہوگا۔ چنانچہ اللہ رب العزت فرماتا ہے:

ما امرنا الا واحدۃ کلمح البصر سمجھانے کے لیے ہے وگرنہ اتنے زمانہ کی بھی ضرورت نہیں، تقدیر تو ارادہ تو قیقیہ سے ہو جاتی ہے۔ اس آیت میں ایک وجہ یہ بھی ہے انا کل شیء خلقناہ بقدر کہ عالم خلق اور امر سے ہے اور وفا امرنا واحد عالم امر سے ہے اس کی تھوڑی سی وضاحت یوں ہے کہ مخلوقات کی دو قسمیں ہیں۔

اجسام جو زمین اور آسمانوں سے لے کر حیوانات و بشر تک مادہ سے بنے ہیں اور عالم مادہ کو عالم خلق کہتے ہیں کہ جو تدریجاً بنتا ہے۔ لیکن عالم غیب ماورائے حسن و طبیعت ہے۔ اس عالم کو شرعی زبان میں عالم ارواح یا عالم امر کہا جاتا ہے جو عالم طبع اور مادہ کے مقدارات ہیں۔ اس میں زمانہ کی ضرورت نہیں۔ صرف ارادہ خدا سے فوری ہو جاتا ہے۔ مثلاً خدا اگر چاہے کہ فرشتہ کو یا روح کو پیدا کرے تو کہے ہو "کن و فیکون" پس وہ ہو جاتا ہے۔

کہیں عالم مادہ، خلق میں ارادہ خدا اس طرح ہے کہ تدریج میں فرمانے کے ساتھ محقق ہو۔ مثلاً نطفہ چالیس دن کا ہو جائے تو علقہ ہوگا پھر ایک مدت کے بعد مضغہ

ہوگا، پھر ہڈیوں کا جال بچھ جاتا ہے، پھر اس میں روح ڈالی جاتی ہے پھر نو (۹) ماہ کے بعد ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے پس پہلی آیت میں فرمایا انا کل شیء خلقناہ بقدر " یعنی ہم نے ہر جسم کو ایک مدت اور ایک اندازۂ معین میں پیدا کیا" اور اس آیت میں جو ما امرنا الا واحدۃ ہے یعنی بغیر آنکھ جھپکنے کی دیر میں پیدا کرنا مراد ہے۔

قیامت کے برپا ہونے میں دیر نہ لگے گی

بعض مفسرین نے لکھا ہے وما امرنا الا واحدۃ یعنی قیامت کو برپا کرنے کے لیے ہمارا صرف ایک ارادہ کافی ہے۔ کوئی معطلی نہ ہوگی۔ ادھر ارادہ پکا ہوگا ادھر قیامت برپا ہو جائے گی، وما امرنا بالساعۃ الا کلمح بالبصر، چونکہ پہلی آیات میں فرمایا کہ قیامت کافروں کے لیے وعدہ گاہ ہے بل الساعۃ موعدھم اگر کوئی اس سے یہ شک کرے یہ کس طرح ہوگا کہ دنیا و آخرت کے حساب کتاب کے لئے اس دنیاوی عمر کے مطابق یا اس سے زیادہ عرصہ لگے گا کیونکہ ہر شخص کے بلوغ کے وقت سے لے کر موت تک تحقیق کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بہت وقت درکار ہے۔

جواب یہ ہے کہ وما امرنا الا واحدۃ "ہمارا حساب و کتاب بس ایک ارادہ ہے۔"

پھر وہ کام آنکھ جھپکنے سے پہلے ہی ہو جائے گا۔ ارادۂ خدا سے فوراً پہلے اعمال نامے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوں گے جن پر تمام چھوٹے بڑے اعمال لکھے ہوں گے۔

بعض لوگوں کا حساب کتاب ایک لمبی مدت تک معطل ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ حساب لینے والا عاجز ہوگا بلکہ یہ طولانی مدت کا حساب و کتاب بڑے گنہ گار لوگوں کا ہے،

جو مومنین کے لیے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ جبکہ حساب لینے والا تو سریع الحساب ہے' ان کا حساب تو وہ چشم زدن میں کر لے گا۔

جس طرح اللہ اس دنیا میں اربوں انسانوں اور حیوانوں کو روزانہ بغیر کسی تاخیر کے روزی دیتا ہے اور کسی کا رزق دوسروں کے سبب سے نہیں رکتا' بعینہٖ دوسروں کا حساب مانع نہ ہوگا بلکہ ہر کسی کو اپنا حساب دینا ہوگا۔

پیدائش اور ہلاکت

تفاسیر کی کتابوں میں ان روایتوں کے بارے میں ایک اور چیز لکھی ہے کہ خلق امر کے مقابل میں ہے۔ یعنی خلق کے معنی ایجاد کے ہیں۔ اور امر موت یا ہلاکت ہے۔ پس اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ ہم نے تمام چیزوں کو جتنی مقدار کے ساتھ ایجاد کیا' یہ تمام چیزیں آنکھ جھپکنے سے پہلے ختم ہو جائیں گی۔

حکایتوں میں پہلی قسم کی بات کی گئی ہے۔ کہ جب اچانک عذاب آ گیا تو حکم سے وہ سب مر گئے۔ پھر فرمایا:

ولقد اھلکنا اشباعکم فھل من مدکر

''تم جیسوں ہی کو ہم نے مارا تم ان سے جدا نہیں'' کیا کوئی ہے جو اس بات سے نصیحت حاصل کرے

السعید من وعظ بغیرہ خوشبخت ہے وہ شخص جو کسی سے نصیحت حاصل کرے اور بد بخت ہے وہ شخص کہ جو دوسروں کے لیے عبرت کا باعث بنے گا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ تمہیں گذشتہ اقوام سے عبرت حاصل کرنی چاہیے' وہ قومیں کہاں گئیں؟ آج ان کی اولاد تک نظر نہیں آتی' فراعنہ اور ان سے وابستہ لوگ

کہاں گئے؟ اصحاب رس اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے پیامبر کو قتل کیا اور انہوں نے ظالموں کے رویوں کو زندہ کیا وہ کہاں گئے۔ نبی اور آل نبی پر جو ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے رہے وہ آج کہاں ہیں۔

لوحِ محفوظ

کل شیء فعلوہ فی الزبر.

جو فعل بھی وہ کرتے ہیں وہ ان کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے' اور ان کا ریکارڈ لوح محفوظ پر ثبت ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز غرضیکہ کردار' گفتار' اعمال' رزق' زندگی 'عاقبت' فخر و تونگری وغیرہ سبھی لوح محفوظ میں مرقوم ہیں۔ پس اس آیت میں دو احکامات پائے جاتے ہیں ایک یہ کہ امور تقدیرات کے بارے اشارہ ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ پس پہلا معنی تو گذشتہ آیت میں ہے کہ انا کل شیء خلقناہ بقدر کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت کے معنی میں ایک وجہ یہ بھی ذکر ہوئی ہے کہ تمام امور و معاملات پیدا ہونے سے پہلے مقدر (اندازہ) کیے گئے ہیں' اور ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ مقدرات کی دو قسمیں ہیں حتمی اور غیر حتمی۔ لہٰذا اپنے مطلب کی طرف یہ آیت تاکید کر رہی ہے۔ کل شیء فعلوہ فی الزبر یعنی جو کفار و مشرکین نے اپنے انبیاء کو تکالیف اور اذیتیں دیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی عالی لوحوں (زبر = زبور کی جمع ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں) پر لکھی ہوئی ہیں۔

نیک بخت اور بد بخت ماں کے پیٹ میں

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے اس روایت کے بارے میں پوچھا گیا:

اَلسَعِیۡدُ سِعِیۡدٌ فِیۡ بَطۡنِ اُمِّہٖ وَالشَّقِیُ شَقِیٌّ فِیۡ بَطِنٌ اُمِّہٖ

''یعنی نیک بخت ماں کے پیٹ میں بھی نیک بخت ہوتا ہے۔''

اور بد بخت ماں کے پیٹ میں بھی بد بخت ہوتا ہے۔'' امام موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب فرمایا:

''کہ جو بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے علمِ خدا میں اس کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ یہ بچہ سعداء میں سے ہے یا اشقیاء میں سے یہ بچہ بڑا ہو کر ہدایت پائے گا یا گمراہی کی وادی میں کھو جائے گا۔''

مصائب میں بلند حوصلہ رہ کر صبر کرنا

ہر چھوٹی بڑی چیز لوح محفوظ اور علم الٰہی میں لکھی ہوئی ہے۔ اس موضوع کے علم کا لازمہ یہ ہے کہ جو مصائب و آلام مومنین پر آئیں یا جو کچھ خدا نے ان کے لئے مقرر فرمایا ہے وہ اس پر راضی ہوں اور سر تسلیم خم کریں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا مہربان و کریم ہے۔ جو بندہ کے لئے مصلحت ہے وہی تقدیر فرماتا ہے۔ مثلاً عمر دراز یا کوتاہ' دولت' یا غربت' عزت یا ذلت' جو چیز بھی خدا نے بندے کے لئے مقدر فرمائی ہے وہ بہتر ہے۔ وہ ہم سے بہتر جانتا ہے۔ وہ ذات کریم ہم سے زیادہ محبت رکھتی ہے۔ نیک محبت بھی اس نے دی ہے لہٰذا اس کی ہر تقدیر کے سامنے خوشنود اور راضی بہ رضا رہنا چاہیے۔

گناہان کبیرہ میں سے ایک گناہ ''قضا و قدر'' الٰہی پر اعتراض کرنا ہے۔ وہ

شخص بد بخت ہے جو خدا سے بغض رکھے ہوئے مر جائے' کتنا اچھا ہو گا کہ اگر مومنین اس دعا کو جو ہم تک رسول گرامی کے ذریعے سے پہنچی ہے یاد کر لیں' اور اس کے مطالب میں غور و فکر کریں۔ وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا تُبَاشِرُ بِہٖ قَلْبِیْ وَیَقِیْنًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمُ اَنَّہُ لَنْ یُّصِیْبُنِیْ اِلَّا مَاکَتَبْتَ لِیْ وَرَضِّنِیْ مِنَ الْعِیْشِ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

کہ اے اللہ! ہمیں وہ ایمان عطا فرما کہ جس سے ہمارے دل ہمیشہ منور رہیں' ایسا یقین عطا فرما کہ جو ہم پر نازل ہونا تو نے مقدر فرمایا ہے' اور ہمیں اس رزق پر خوش رکھ جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا۔

نامہٴ اعمال

ان آیات شریفہ میں دوسری وجہ صحیفہ اعمال کی ہے یعنی جو کفار و مشرکین کرتے تھے انہوں نے ہمارے پیغمبروں کو دیں' جو ان کے نامہ اعمال میں درج ہیں۔ اور مناسب وقت پر ان کا حساب لیا جائے گا۔ ان کا ہر چھوٹا بڑا کام نامہ اعمال میں ثبت ہے'

یہاں تک کہ پھونکنا بھی لکھا جاتا ہے

شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے کتاب الاعتقادات میں روایت ذکر فرمائی ہے کہ آگ کو پھونک مارنا بھی نامہٴ اعمال میں لکھا جاتا ہے اگرچہ یہ عمل بہت چھوٹا اور حقیر ہے' لیکن شریعت اسلامی میں پھونک بھی برائے خدا ہوتی ہے۔ مثلاً ان لوگوں کا کھانا پکانے کے لئے جن کا نفقہ اس پر واجب ہے یا فقراء کو کھانا کھلانے یا نیاز امام حسین کی پکوائی

ہو رہی ہے تو یہ پھونک بھی اعمال حسنہ کا جز شمار ہو گی۔ اور کبھی یہ پھونک انگور کو شراب بنانے کے لئے ہوتی ہے اگر چہ بہت معمولی چیز ہے لیکن یہ گناہوں میں شامل کر کے لکھی جاتی ہے۔ مختصراً ہر عمل اگر چہ ذرا برابر ہی کیوں نہ ہو وہ ضائع نہیں جاتا' بلکہ وہ لوح تقدیر پر رقم کیا جاتا ہے۔ مثلاً والدین کے چہرے پر غصے سے نگاہ ڈالنا (اگر چہ یہ عمل کوتاہ نظر آتا ہے لیکن یہ) گناہان کبیرہ میں شمار ہوتا ہے۔ بہت سارے اعمال خیر کو یہی گناہ ضائع کر دیتا ہے۔ اعمال حسنہ کا مطلب بھی یہی ہے۔ لہٰذا قرآن کی نص کے مطابق ہر چھوٹا بڑا عمل شمار کیا جائے گا۔

يَقُوْلُوْنَ يَاوَيْلَتَنَا مَالَ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصَيْهَا. (سورہ الکھف' آیت ۴۷)

''اور کہیں گے اے ہماری خرابی' یہ کیسا اعمال نامہ ہے' نہ جھوٹی بات کو چھوڑتا ہے اور نہ بڑی بات کو' مگر یہ کہ اس نے اس کا احاطہ کر لیا ہوا ہے۔''

نامہ اعمال اور قرآن

نامہ اعمال اور کراماً کاتبین کا مسئلہ دین اسلام میں شمار ہوتا ہے' اس کی قطعیت احادیث متواترہ اور آیات قرآنی سے ثابت ہوتی ہے' قرآن مجید میں دس مقامات سے زیادہ اس کا تذکرہ ہوا ہے۔ جیسے:

هَـذَا كِتَـابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.

''وہ جو کام کرتے ہیں ہم ان کو لکھ کر نسخہ اپنے پاس رکھتے ہیں''

یا قرآن ہی میں ہے کہ:

اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰیهُمْ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ. (سورہ ۴۳ ـ آیہ ۸۵)

"وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے حالانکہ ہمارے فرشتے تو انہیں لکھتے بھی ہیں۔"

کیا عطر کی خوشبو اور گندی بدبو برابر ہیں؟

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے پوچھا گیا کہ کیا کراماً کاتبین افکارِ قلوب سے بھی آگاہ ہوتے ہیں یا فقط ظاہری اعضاء کے اعمال کو لکھتے ہیں؟ تو جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ کیا گٹر کی بدبو اور عطر کی خوشبو برابر ہیں؟ یعنی جب گٹر کو کھولا جائے تو اس کی بدبو انسان کو اذیت دیتی ہے، لیکن جب عطر کی شیشی کھولی جائے تو اس کی خوشبو سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے۔ جو شخص اچھی افکار اور دل میں عمل صالح کا منصوبہ بنائے تو اس کی عطر کی خوشبو سے ملائکہ متوجہ ہو جاتے ہیں اور اس کے لئے نیکی لکھ دیتے ہیں اور جب گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو فرشتے گناہ لکھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن جب تک فعل سرزد نہیں ہو جاتا اس وقت تک نہیں لکھتے۔ جبکہ نیک کام کے ارادہ کرنے سے ہی نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔ قرآن میں اس کے بارے میں ارشاد ہے۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰیٓ اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ.

قبولیت سے مواقع ہٹائے جائیں

عدۃ الداعی میں علامہ حلی، انوار نعمانیہ میں سید جزائری، تفسیر البرہان میں سید

ہاشم بحرانی ان سب بزرگ علماء نے معاذ والی روایت رسول پاکؐ سے نقل کی ہے:

معاذ کہتے ہیں کہ میں پیامبرؐ کی خدمت اقدس میں موجود تھا کہ آپ نے

فرمایا:

''میں تم کو ایک حدیث بتایا: ہوں اگر تم نے اس پر عمل کیا تو تم نے

بہت فائدہ اٹھایا اور اگر عمل نہ کیا تو تمہارے اوپر حجت پوری ہو

گئی۔''

''فرمایا: جب بندہ نامہ اعمال کو بلندی میں لے جاتے ہیں، جب پہلے آسمان پر پہنچتا ہے تو ڈیوٹی پر کھڑا فرشتہ کہتا ہے کہ اس کو واپس پلٹا دو کیونکہ میرا فرض منصبی یہ ہے کہ جو شخص غیبت کرنے والا ہے اس کے اعمال کو یہاں سے نہ گزرنے دوں اس کے اعمال کو رد کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے کے اعمال کو اوپر لے جاتے ہیں۔ وہ پہلے آسمان سے تو گزر جاتا ہے، لکھا ہے جب دوسرے آسمان پر پہنچتا ہے تو ایک فرشتہ سامنے آتا ہے کہ میری ذمہ داری ہے، کہ جو شخص تقویٰ نہیں رکھتا اس کے اعمال کو قبول نہ کروں، پھر کسی اور شخص کے اعمال کو اوپر لے جاتے ہیں۔ پہلے دو مرحلوں سے گزر جاتا ہے، لیکن تیسرے مرحلہ میں فرشتہ سامنے آجاتا ہے کہ اس عمل کو واپس پلٹاؤ کیونکہ میری ذمہ داری ہے کہ میں متکبر کے عمل کو واپس ٹھکرا دوں۔ پھر کوئی اور عمل اوپر لے جاتے ہیں پہلے تین مرحلے تو گذر جاتے ہیں چوتھے مرحلے پر ایک فرشتہ سامنے آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ جس شخص میں حسد ہوتا ہے میری ذمہ داری ہے کہ اس کے عمل کو قبول نہ کروں۔

پھر کسی شخص کے عمل کو پانچویں مرحلہ پر فرشتہ روکتا ہے کہ جو عبادت پر غرور کرتا ہے اپنی عبادت کو بہت بڑا پہاڑ سمجھتا ہے اس کے عمل کو واپس کر دوں یہ میری ذمہ داری ہے۔ پھر ایک شخص کے عمل کو چھٹے مرحلہ پر روکا جاتا ہے کہ بے رحم کا عمل قبول

نہیں۔ جس کے دل میں ذرا بھر نرمی نہیں، دل میں قساوت و کدورت رکھتا ہے تو اس کے اعمال بھی رد ہو جائیں گے۔ ساتویں آسمان پر فرشتہ آواز دیتا ہے۔ میں اخلاص کو دیکھنے والا فرشتہ ہوں لہٰذا کسی ریاکار کا عمل قبول نہیں۔ کسی کا عمل سات حجابوں سے آگے چلا جاتا ہے۔ تو ملائکہ کو آواز آتی ہے۔ اے فرشتو! اس نے میرے لئے خالص نیت نہ کی تھی لہٰذا اس کا عمل بھی قبول نہیں کرتا۔ غور کیا کہ کتنا باریک نظام ہے جو ریا فرشتہ سے بھی مخفی رہتا ہے وہ خدا سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

پیامبرؐ کی موت وحیات رحمت ہے

حضرت رسول پاکؐ نے فرمایا کہ میں آپ کے لئے رحمت ہوں اور میری نجات بھی رحمت ہے، صحابہ نے کہا زندگی میں تمہارا رحمت ہونا قرآن نے بتا دیا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ.

''جہاں تو ہوگا عذاب نہ ہوگا۔ (سورہ ۸، آیہ ۳۳)''

لیکن تمہاری موت کیسے رحمت ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا:

میری موت کے بعد تمہارے اعمال میرے پاس پہنچائے جائیں گے اگر نیکیاں ہوئیں تو دعا کروں گا کہ خدا ان کو قبول فرمائے اور اگر برائیاں ہوئیں تو تمہارے لئے بخشش کی دعا کروں گا۔

چہ غم دیوار امت را کہ دارد چون تو پشتیبان

چہ باک از موج بحر آنرا کہ باشد لوح کشتیبان

یہ اس صورت میں ہوگا کہ جو قابل اصلاح ہو، لیکن جس کا نامہ اعمال ظلم وستم اور گناہوں سے پر ہو تو پھر ہمیں خدا، رسولؐ، آئمہ اہل بیت اور ملائکہ سے شرم آنی چاہئے

کیونکہ ان سب نے بھی ہمارے نامہ اعمال دیکھنے ہے۔ جیسے قرآن فرماتا ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ. (سورہ۹، آیہ ۱۰۶)

''اور کہہ دو کہ تم عمل کیے جاؤ، عنقریب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور کامل صفت مومنین ہمارے اعمال کو دیکھ لینگے۔''

تقدیر کا جبر سے کوئی ربط نہیں

جو مطالب ان دو آیتوں کے پہلے (معانی) ذکر ہوئے ہیں کسی طرح بھی مذہب باطل جبر کی تائید نہیں کرتے۔ جبر ہر عاقل اور باشعور شخص کے وجدان کے خلاف ہے۔ شاعر نے جبر کے نظریہ کے خلاف کیا خوب شعر کہا ہے ۔

اینکہ گوئی این کنم یا آن کنم
خود دلیل اختیار است ای صنم

ہر شخص اپنے وجدان سے اپنے اختیار سے نماز پڑھتا ہے اور اپنے اختیار سے گناہ کرتا ہے۔ مسجد اور سینما حال دونوں کا راستہ کھلا ہے۔ ہر شخص ان دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرسکتا ہے۔ کسی کو مجبور کر کے نہیں لایا جا سکتا، بلکہ ذکر خدا کا شوق اور کلام الٰہی سننے کا ذوق اور حقائق قرآن اس طرف لاتے ہیں، اسی طرح گنہگار کو گناہ کا شوق اور عفت و عصمت کے منافی امور ان کے مشاہدے کا منکرات و برائیوں کی طرف کھینچتا ہے۔ نہ آپ مسجد کی طرف آنے کے لئے مجبور ہیں نہ وہ سنیما کی طرف جانے میں مجبور ہیں۔

واضحات کے سامنے دلیل قائم کرنا

محقق قمی فرماتے ہیں اگر کسی واضح چیز کے مقابل ہزار دلیل بھی لائی جائے تب بھی قابل قبول نہیں' اگر کوئی جبر کے لئے ہزار دلیل ثابت کرے لیکن اس حدیث اَلْسَعِیْدُ سَعِیْدٌ فِیْ بَطَنِ اُمِہٖ وَالشَّقِیُ شَقِیٌ فِیْ بَطنِ اُمِہٖ کا جبر سے کوئی ربط نہیں۔ یعنی جب بچہ شکم مادر میں نیک بخت ہے تو جب دنیا پر آتا ہے تو اس کا کوئی اختیار نہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو بد بخت کر دے۔ کچھ نیک بخت لوگ بے اختیار تھے اور مجبوراً نیک بخت ہو گئے حالانکہ اس حدیث کے معنی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں۔ شکم مادر میں بچے کو خدا جانتا ہے کہ دنیا میں جانے کے بعد یہ اپنے اختیار سے نیکی کی طرف جائے گا' یا برائی کی طرف جائے گا۔ اس کا جبر سے کیا تعلق ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ بعض ملائکہ بھی جانتے ہیں کہ یہ بچہ (جو شکم مادر میں ہے) شقی ہو گا یا سعید ہو گا۔

علم معلوم کی علت نہیں

متکلمین میں سے خواجہ نصیر الدین طوسی اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ علم معلوم کی علت نہیں بلکہ معلوم کے تابع ہے۔ مثلاً آپ جانتے ہیں کہ چند گھنٹوں کے بعد سورج طلوع ہو گا؟ کیا آپ کا طلوع کے متعلق علم اس بات کا سبب ہے کہ طلوع ہو گا یا نہ ہو گا' یہ بے ربط بات ہے کہ جو خیام کے شعر میں ہے کہ:

می خوردن من حق ز ازل مید انست
گر می نخورم علم خدا جہل بود

"شراب پینا میری مجبوری ہے کیونکہ خدا جانتا ہے کہ اگر نہ پیوں تو

علم خدا پر جہالت لازم آئے گی۔"

کوئی اس شاعر کو سمجھائے کہ جب خدا جانتا ہے شراب پینے کا تو خود سبب ہے یعنی اگر تو نہ پینا چاہئے تو ترک نہیں کر سکتا' بلکہ خدا جانتا ہے کہ اپنے اختیار سے یہ شراب پیئے گا اور اپنی جہالت کی وجہ سے اس قسم کے خرافات کہے گا۔ لہذا علم کبھی سبب نہیں بلکہ معلوم کے تابع ہے۔ ایسا ہو گا اس کے اختیار میں ہے' ہم نے اجمالی طور پر جواب دیا ہے' اس کے علاوہ بھی جواب دیئے گئے ہیں' لیکن وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

الخیر بتوفیق اللہ

جبر وتفویض کے بارے میں حضرت مولا علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

اَلْخَیْرُ بِتَوْفِیْقِ اللّٰہِ وَالشَّرُّ بِخَذلاَنِ اللّٰہ.

یعنی کار کی خیر توفیق خدا دیتا ہے (مجبور نہیں کرتا) اور کار شر جو شخص بھی کرتا ہے خدا اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے تو وہ کرتا ہے۔"

اگر انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو کہاں خیر کی امید رکھی جا سکتی ہے؟ بلکہ اس کے شامل حال لطف خدا اور اللہ کی مدد ہو تو پھر ہی وہ اپنے اختیار سے کمک الہی کے سبب (جس کو توفیق کہتے ہیں) کار خیر کی طرف آئے گا جیسا کہ دعا میں ہے:

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ تَوْفِیْقَ الطَّاعَۃِ وَبُعْدَ الْمَعصِیَۃِ.

"اے خدا! مجھے گناہ سے دور ہونے اور اپنی بندگی کرنے کی توفیق عطا فرما۔"

بلعم باعور کا برا انجام

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ بلعم باعور نے علم و عمل میں اتنی ترقی کی کہ مستجاب الدعوات ہو گیا (جس کی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے) اور وہ اللہ کے اسم اعظم کو جانتا تھا۔ لیکن وقت موت کفر کی حالت میں مرا' کہ قرآن نے اس کو کتے کے مثل کہا ہے:

واتل علیهم نبأ الذی آتیناه آیاتنا فانسلخ منها فاتبعه الشیطان فکان من الغادین ولو شئنا لرفعناه بها ولکنه اخلا الی الارض واتبع هواه فهشله کمثل الکلب ان تحمل علیه یلث او تترکهٔ یلهث (سورہ ۷' آیہ ۷۵)

وہ کس طرح بدبختی کی طرف آ گیا تھا؟

''حضرت نے فرمایا کہ خدا نے ایک لحظہ کے لئے اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ اس نے شکران نعمت نہ کیا تھا' بلکہ کفران نعمت کیا تو خدا نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ خدا کے لطف سے محروم ہو گیا۔ جو شخص لطف خدا سے محروم ہو جاتا ہے شیطان کے لئے اس کے پاس آنا آسان ہو جاتا ہے۔''

بہر حال اجبار و اکراہ تو کسی طور بھی روا نہیں۔ لَا اِکرَاہَ فِی الدِّیْن ۔ نیکی نیکی کا سبب ہے اور توفیق الٰہی خیرات کا سبب ہے' اور برائی خدا کا کسی شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دینے سے ہوتی ہے۔

استقلال کامل نہیں ہے

حرکت اختیاری اور اضطراری کی مثال یہ دی جاتی ہے کہ جو ہاتھ رعشہ کا

مریض ہو بغیر اپنے حامل کے ارادے کے خود بخود حرکت کرتا رہتا ہے بلکہ اگر وہ روکنا چاہے تو بھی نہیں رکتا۔ یہ حرکت اضطراری ہے۔ لیکن ایک حرکت اختیاری ہے جیسے کوئی شخص اپنے ہاتھ کو خود حرکت دے۔ حرکت دیتا ہے تو لقمہ اٹھا لیتا ہے۔ پھر منہ میں رکھتا ہے۔ یہ اپنے اختیار اور ارادہ سے حرکت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے تمام کام دوسری قسم سے ہیں یعنی اختیاری ہیں، جو شخص سعادت کی طرف جاتا ہے وہ اپنے اختیار سے جاتا ہے اور جو بدبختی کی طرف جاتا ہے تو وہ بھی اپنے اختیار سے جاتا ہے لیکن جہاں جبر نہیں ہے وہ اختیار کامل بھی نہیں ہے، استقلال نہیں کہ بندہ جو بھی ارادہ کرے وہ ہو جائے بلکہ اگر بندے کا ارادہ خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا تو ہر کام ہو جائے گا۔ مختصراً جو خدا چاہے وہ ہوتا ہے اور جو بندہ چاہے وہ نہیں ہوتا۔

تفویض کیا ہے؟

تفویض جبر کی ضد ہے۔ یعنی عبد اپنے تمام کاموں میں فاعل مَایَشَاء ہے۔ یعنی جو چاہے کرلے یا جو چاہے ہو جائے، ایسا نہیں ہے۔ پس تفویض یہ ہے کہ بندے کو تمام قدرت بطور استقلال ہو جو چاہئے کرے جو چاہئے ہو جائے ایسی تفویض کا باطل ہونا بھی جبر کی طرح وجدانی ہے۔ مثلاً آپ بہت سے کار ہائے خیر انجام دینا چاہتے ہیں لیکن نہیں دے سکتے کیونکہ وسائل مہیا نہیں ہیں۔ جب کسی نے حضرت امیر المومنین سے پوچھا کہ آپ نے خدا کو کس طرح پہچانا ہے؟ تو آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ:

عَرَفتُ اللّٰہَ بِفَسخِ العَزَائِمِ.

''میں نے ارادوں کے ٹوٹ جانے سے خدا کو پہچانا۔''

مثلاً میرا ارادہ ہے کہ میں یہ کام کروں لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا میرے ارادہ کی

مخالف ہوتی ہے تو وہ کام نہیں ہو سکتا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ اصل مدبر کوئی اور ذات ہے اگر میں کامل اختیار رکھتا تو ہر کام ہو جاتا۔

کوئی کام بغیر تقدیر کے نہیں

اصول کافی میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''آسمانوں اور زمین میں کوئی امر بغیر قضا و قدر الٰہی کے اور اذن خدا کے نہیں ہوتا، وہ امر پہلے لوح محفوظ پر لکھا ہوتا ہے۔''

جیسے قرآن مجید میں ہے:

مَـا اَصَـابَ مِـنْ مُـصِيْبَةٍ فِـى الْاَرْضِ وَلَا اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِى كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَبْرَاَهَا اَنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ.

''جو مصیبت زمین میں اور نفوس میں واقع ہوتی ہے، وہ لوح محفوظ و تقدیر کی کتاب پر ثبت ہوتی ہے۔ اور یہ کام خدا کے لئے آسان ہے۔''

پس ہماری فکر اس قابل کہاں کہ ہم موضوعات کلی کو تصور میں لا سکیں۔

بحث کا نتیجہ

مختصراً مطلب یہ ہوا کہ بندے اپنے افعال میں مجبور نہیں، اختیار رکھتے ہیں، لیکن یہ اختیار کامل نہیں ہے بلکہ یہ ارادہ مشیت خدا سے مربوط ہے۔ اگر مشیت خدا ہوئی تو جو بندے کی حاجت ہے۔ تو وہ پوری ہو جائے گی، ورنہ ناممکن ہے۔

مفوضہ لعنتی ہیں

شیعہ وسنی روایات میں مشہور ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

لِكُلِّ اُمَّةٍ مَجُوسٌ وَمَجُوسُ هٰذِهِ الاُمَّةِ الْقَدرِيَّةِ.

''ہر امت کے مجوسی ہوتے ہیں اور میری امت کے مجوسی قدریہ ہیں۔''

پھر فرمایا:

لَعَنَ اللّٰهُ الْقَدَرِيَةَ عَلٰى لِسَانِ سَبْعِيْنَ نَبِيًّا.

''خدا نے قدریہ پر ستر (۷۰) پیغمبروں کی زبانی لعنت فرمائی ہے۔''

اس قسم کی روایات بہت زیادہ ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قدریہ کون لوگ ہیں جن کے کفر کی تصریح بیان ہوئی ہے۔

قدریہ جبریہ اور مفوضہ ہیں

اصطلاح میں قدریہ کا کبھی مذہب جبریہ پر اور کبھی مفوضہ پر (جبریہ کے جو مقابل ہیں) اطلاق ہوتا ہے۔ پس دونوں اس میں مشترک ہیں۔ جس چیز کی طرف مومنین کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ اپنے حالات کے پیش نظر کبھی جبری ہو اور کبھی تفویضی ہو یعنی ان امور کی نسبت اتفاقاً اس کی مرضی کے مطابق ہو گئی ہو تو وہ تفویضی ہے اور وہ امور جو اس کی مرضی کے مخالف ہوں ان میں وہ جبری ہو جائے۔ مثلاً اگر خدا نے اسے بیٹا دیا، اور وہ اس کو خدا کی عطا نہیں سمجھتا اور بجائے شکر خدا کے غنا اور لہو ولعب کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ تو معصیت الٰہی ہے۔ اگر اس نعمت کو وہ خدا کی طرف سے سمجھتا تو اس نعمت کے حصول پر گناہ کیسے کرتا؟

اگر یہی بیٹا بڑا ہو جائے اور مر جائے تو وہ جبری ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کو صدفی

صد خدا کی طرف سے سمجھتا ہے اور قضا و مقدر پر اعتراض کرتا ہے۔ یا مثلاً بیماری اور موت کو خدا کی طرف سمجھتا ہے۔ لیکن بیماری سے شفا ملنے کو ڈاکٹر کی طرف سے منسوب کرتا ہے۔ یا پھر اگر زیادہ دولت مل جائے تو اپنے بازو کے زور، قلم کی نوک، زبان کی گویائی یا ہمت کی بلندی اور فوق العادہ قدرت رکھنے کا دعویدار بن جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ ہاتھ سے چلی جائے تو یہ امر خدا کی طرف منسوب کرتا ہے، جیسا کہ قارون نے کہا تھا:

قَالَ اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ.

"یہ میری دولت ہے اور صرف اپنے علم کیمیا کی بدولت ہے۔" (سورہ القصص ۲۸۔ آیہ ۷۸)

میری قدرت اللہ کی قدرت سے ہے

عبایہ ربعی اسدی حضرت امیر المومنین کی خدمت میں آیا اور پوچھا کہ کیا بشر کی قدرت استقلالی ہے؟ کیا وہ اپنے افعال و اقوال میں مکمل اختیار رکھتا ہے؟

حضرت نے اس سے پوچھا کیا تیری قدرت خدا کے ساتھ ہے یا بغیر خدا کے یا دونوں کی اپنی اپنی قدرت ہے؟؟؟ تو وہ جواب نہ دے سکا،

تو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا:

قَالَ لَهُ الْاِسْتِطَاعَةُ تَمْلِكُهَا مَعَ اللّٰهِ اَوْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاِيَّاكَ اَنْ تَقُوْلَ وَاحِدَةٌ مِنْهُمَا فَتَرْتَدَّ فَقَالَ وَمَا اَقُوْلُ يَا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ قُلْ اَمْلِكُهَا بِاللّٰهِ الَّذِیْ اِنْشَاءَ مَلَّكْتُهَا

"اگر تو یہ کہے کہ یہ توانائی اور قدرت میری ہے تو کافر ہو گیا اور اگر تو یہ کہے کہ میری اور خدا دونوں کی توانائی اور قدرت سے کام

ہوتے ہیں تو پھر تو مشرک ہو گیا۔"

(یعنی خود کو عدل خدا میں شامل قرار دیا) تو اس نے عرض کیا تو پھر مجھے کیا سمجھنا چاہیے؟ آپ نے فرمایا:

"تو یہ کہہ سکتا ہے کہ میں توانائی رکھتا ہوں البتہ خدا کی قدرت سے۔ یعنی توانائی ہے لیکن توانائی قدرت خدا کی ہے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

لَا یَمْلِکُ لِنَفْسِہٖ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا وَلَا مَوْتًا وَلَا حَیٰوۃً وَلَا نُشُوْرًا.

اعمال نامے کس لئے؟

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَّكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ۔

یہاں زبر سے مراد نامہ اعمال ہے کہ جو کچھ کیا وہ اس میں لکھا ہوا ہے۔ یہ معاملہ اس دنیا کی طرح کا نہیں کہ کوئی یہ خیال کرے اور تعجب کرے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اولین و آخرین کے اعمال لکھے جائیں؟ اس لئے کتنے لکھنے والے، کتنے کاغذ، کتنے قلم اور کتنی روشنائی درکار ہوگی اور ایک بہت بڑی کتاب کا وجود ضروری ہے حالانکہ ہم نہ کاغذ دیکھتے ہیں اور نہ ہی کاتب نظر آتے ہیں؟ یہ سوچ جہالت اور کوتاہی فکر کی وجہ سے ہے۔

اگر انسان اپنے اندر ہی غور کرے تو وہ تختی جو اس کے نفس میں موجود ہے، جس کو حافظہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس حافظہ میں کتنی چیزیں ہیں؟ اور اگر ایک شخص اپنے حافظہ کے اندر ثبت اور موجود چیزوں کو اکٹھا کرے تو کئی کتابیں نئی بن جائیں گی حالانکہ حافظہ اس کا بہت محدود ہے۔ گویا کہ معنوی علم میں یہ چیزیں نہیں۔

خدا جانتا ہے تو کراماً کاتبین کی کیا ضرورت تھی؟

خدا کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ یعنی خدا کے علم سے کوئی چھوٹی اور بڑی چیز مخفی و مستور نہیں ہے، قرآن نے اس کی تصریح بیان فرمائی ہے۔

اِنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْد. وَاَحَاطَ بِكُلِّ لِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا

وَعَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ مُحِیط.

''خدا ہر چیز کا شاہد و عالم ہے اور ہر شئے پر محیط ہے۔''

بندوں کے اعمال کتابوں میں تو وہ لکھے جو بھول جاتا ہو جبکہ خدا سے نسیان اور بھول چوک نہیں ہوتی۔ اس کے پاس سب معلومات ہیں تو پھر کراماً کاتبین کیوں کر لکھتے ہیں؟ یہ اعتراض علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی تیسری جلد میں نقل کیا ہے۔ ایک زندیق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ ہر شخص پر دو فرشتے مقرر ہیں جو اس کے اعمال لکھتے ہیں' حالانکہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے اور بھولتا بھی نہیں ہے؟ امام علیہ السلام نے کئی جواب دیئے' آپ نے ارشاد فرمایا:

''خدا نے فرشتے کے لئے عبادت قرار دی جو اس کا رزق ہے (ہاں فرشتے کا رزق عبادت ہے) ہر صنف کا فرشتہ اپنی مخصوص عبادت کرتا ہے۔ ان میں سے ایک صنف کراماً کاتبین کی ہے کہ جن کی عبادت انسان کے اعمال کو ثبت کرنا ہے۔

دوسرے یہ کہ خدا نے فرشتوں کو بندے پر گواہ بنایا ہے۔ جب بندہ توجہ کرے گا کہ میرے اعمال تحریر ہو رہے ہیں تو وہ زیادہ احتیاط کرے گا۔ اور فرشتہ کی موجودگی کا حیا کرے گا۔ کیونکہ کل اسی فرشتہ نے گواہی دینی ہے۔ چنانچہ اس سے شرم کرے گا اور گناہ نہ کرے گا۔

تیسرے یہ کہ چونکہ خدا بزرگ و برتر ہے لہٰذا اس کے کام بھی بہت بزرگ و برتر ہیں۔ بشریت کمزور ہے لہٰذا اس کے کام بھی بہت کمزور اور قلیل ہیں۔ لیکن چونکہ اس بزرگ ہستی کی طرف نسبت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ پس اس اہمیت کو دکھانے کے لئے فرشتے اس کے اعمال کو لکھتے ہیں' اور پیغمبرؐ اور امامؑ کو دکھاتے ہیں۔

انسان کا شیاطین سے تحفظ

چوتھا جواب کراماً کاتبین کے پیدا کرنے میں بھی حکمت ہے اور وہ حکمت مومن کو شیاطین سے محفوظ کرنا ہے۔ جب شیطاتین مومن کے نزدیک ہوتے ہیں تو ملائکہ ان کو دور بھگاتے ہیں۔ ہاں اگر مومن خود شیطانوں کے پیچھے چل پڑے تو یہ اور بات ہے۔ وقتِ موت جب شیطان کی نور ایمان کو چوری کرنے کی پوری کوشش ہوتی ہے تو بھی ملائکہ اس مومن کی مدد کرتے ہیں اور مومن کے نور کو شیطان سے بچاتے ہیں۔

آفات سے بدن کو محفوظ رکھنا

پانچویں حکمت یہ ہے کہ آفات سے بدن کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اس موضوع کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر غیبی مدد نہ ہو تو اتنے خطرناک ماحول میں انسان چوبیس گھنٹے بھی نہ گزار سکے۔ اس لئے بچپن ہی سے ملائکہ شخص کی حفاظت کرتے ہیں۔

مومنین کی خاطر عبادت کرتے ہیں

چھٹی حکمت خلقت کراماً کاتبین یہ ہے کہ جب مومن مر جاتا ہے تو یہ پروردگار سے عرض کرتے ہیں:

"جس کے اعمال لکھنا ہماری ذمہ داری تھی وہ تو مر گیا۔ اب ہم کیا کریں؟"

ان کو جواب ملتا ہے:

"اس مومن کی قبر پر رہو وہ جو کار خیر کرتا تھا اب وہ کام تم اس کے لئے کرو اور اس کا ثواب اس کے لئے لکھتے رہو۔"

مومن کے لئے عزاداری کرتے ہیں

ساتویں حکمتِ خلقت ملائکہ یہ ہے کہ جب مومن فوت ہو جاتا ہے تو اس کے لئے عزاداری کرتے ہیں۔ بلکہ بعض روایات سے تو یہ مستفادہ ہوتا ہے۔ کہ یہ عزاداری کا موقع ان دونوں سے مختص نہیں، بلکہ آسمانوں کے وہ دروازے جن سے مومن کے اعمال اوپر جاتے ہیں۔ جب مومن مرتا ہے تو وہ بھی روتے ہیں اور وہ زمین جس پر وہ عبادت کرتا تھا وہ بھی روتی ہے۔ ہاں زمین کیسے روتی ہے اس کا علم ہمیں نہیں ہے۔

جامع نصیحت

بحار الانور میں ہے کہ ایک دن حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام گزر رہے تھے۔ آپؑ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بے ہودہ باتیں کر رہا ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا: تو کراماً کاتبین سے اپنے نامہ عمل میں اس قسم کی باتیں لکھوا رہا ہے، تمہیں شرم نہیں آتی؟ اگر کسی بادشاہ کو خط لکھنا ہو تو کتنی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی لغو، بے ہودہ اور بے معنی بات نہ ہو، اور خط خوبصورت ہو۔ اس کے علاوہ بہت سی روایات موجود ہیں کہ ہر جمعرات کو مومنین کرام کے اعمال امام زمانہؑ کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

واقعاً کتنی شرم کی بات ہے کہ کسی کے گناہ حضرت صاحب العصر والزمان امام کی خدمت اقدس میں جائیں؟

تم لوگ جو شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو، کیا یہ بری بات نہیں کہ تمہارے سردار اور حاکم تمہارے ان برے کاموں سے پریشان اور دکھی ہو جائیں۔

پرہیز گار بہشتی باغوں میں ہونگے

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّاتٍ وَّنَهَرٍ فِيْ مَقْعَدُ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ.

جب خدا نے کفار کی بدبختی' عذاب دنیا اور روز آخرت کا ذکر کرلیا تو آخر میں متقین کے ذکر پر اس سورہ کو ختم فرمایا: متقیوں کے ذکر اور ان کے درجات کو بیان فرماتے ہوئے یوں فرمایا:

"متقی ایسے باغوں میں ہونگے جو میوہ دار درختوں اور چوڑی نہروں (جو پانی' دودھ' شہد اور شراب طہور کی ہوں گی) سے پُر ہونگے۔"

چنانچہ سورہ محمد میں ارشاد رب العزت ہے:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَا اَنْهَارٌ مِّنْ مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَاَنْهَارٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِيْنَ وَاَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى.

"اس بہشت (میں جس کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے) ایسی

نہریں ہونگی جو خالص پانی سے پُر ہوگی۔ ایسا پانی جو کبھی بھی رنگ
تبدیل نہ کرے گا۔ اور دودھ کی ایسی نہریں ہوں گی جن کا ذائقہ
کبھی بھی باسی نہ ہوگا۔ اور شراب طہور کی ایسی نہریں ہوں گی جن
کے پینے والے ہر وقت ایک نئی لذت محسوس کریں گے۔ (نہ کہ
اس دنیاوی شراب کی طرح جس میں ہزاروں کثافتیں اور خباثتیں
ہوتی ہیں۔) اور خالص شہد کی نہریں رواں دواں ہوں گئیں۔''

جنات پر تنوین تعظیم کے لئے ہے' اور نہر اگرچہ مفرد ہے لیکن یہ انہار کے معنی میں ہے۔ آیات میں یہ الفاظ فاصلہ کے لئے ذکر ہوئے ہیں۔

فِیۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِیۡکٍ مُّقۡتَدِرٍ.

''مقعد'' اسم مکان ہے جس کے معانی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں۔ یعنی اولاً اہل تقویٰ کی قرار گاہ' مقعد صدق ہے یہ ایسی جگہ ہے جو پاکیزہ' ہر لغو سے پاک اور کاملاً پسندیدہ ہے۔

دوسرا یہ کہ اہل تقویٰ بادشاہ کے نزدیک توانا ہیں''ملیک'' ملک کی صفتِ مبالغہ ہے۔ یعنی سلاطین کا سلطان' بادشاہوں کا بادشاہ' عالمین کا رب' خلاصہ یہ ہے کہ اہل تقویٰ رب العالمین کے پاس بیٹھے ہیں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ان کے پاس بیٹھنے کی تفصیل آگے چل کر واضح ہو جائے گی۔

اہل تقویٰ کون ہیں؟

ان آخری دو آیتوں کی تشریح کے لئے تین مطالب کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۱) متقین سے مراد کون لوگ ہیں؟ (۲) مقعدِ صدق کا کیا مطلب اور کہاں

ہے؟ (۳) خدا کے پاس بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟

ا۔ متقین کون ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق:

اِنَّمَا یَتَقَبَّلَ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ

''خیرات اور اعمال صالحہ کا قبول ہونا تقویٰ سے مربوط ہے''

اور

مَثَلَ الْجَنَّۃِ الَّتِیْ وَعَدَ الْمُتَّقُوْنَ

''بہشت میں جانا بھی تقویٰ کی وجہ سے ہے۔''

اور بلند درجات پر پہنچنے کی شرط بھی تقویٰ ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ.

''خدا کے نزدیک شرافت اور عزت تقویٰ سے ہے۔''

فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔

''خدا کی محبت بھی تقویٰ کی وجہ سے ہے۔''

تقویٰ لغت میں وقایہ سے ہے جس کے معنی حفاظت اور بچانے کے ہیں۔ تفسیر مجمع البحرین میں لکھتے ہیں کہ اس کے معنی اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچانا ہے جو نقصان پہنچائے۔

لیکن اصطلاح اور روایات اہل بیتؑ میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ جس کام کا خدا نے حکم دیا ہے بندہ اس کو انجام دے اور جس سے خدا روکے اس سے رک جائے۔ یعنی واجبات کو ادا کرے اور محرمات سے بچے' یہ تقویٰ کا پہلا مرحلہ ہے۔ اگر ہو سکے تو

مستحبات کو بھی ادا کرے اور مکروہات سے بھی بچے، یہ کتنی بڑی سعادت ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَلتَّقْوىٰ اَنْ لَا يَفْقَدَکَ اللّٰهُ حَيْثُ اَمَرَکَ وَلَا يَرَاکَ حَيْثُ نَهَاکَ.

"تقویٰ کا مطلب ہے کہ اللہ نے جو تجھے حکم دیا ہے اس کو مت چھوڑ اور جس سے تجھے روکا ہے اسے مت بجالا۔"

مقصد یہ ہے کہ امام علیہ السلام واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کو تقویٰ سمجھتے ہیں۔ یعنی اگر ان دو میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو تو مقصد حاصل نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص ہمیشہ ذکر خدا کرتا ہے، اور ساتھ ساتھ گناہ بھی کرتا ہے تو پھر اس ذکر کا کیا فائدہ؟ ذکر خدا کی تو خاصیت یہ ہے کہ وہ گناہ کو قریب ہی نہ آنے دے گا۔

گناہ نہ کرنا بہتر ہے

پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اگر کوئی شخص مکان تعمیر کرتا ہے اور پھر گرا دیتا ہے تو اس کو عمارت نہیں کہا جاتا، لیکن اگر تھوڑی تھوڑی ہی تعمیر کرتا ہے تو یہ کم از کم عمارت تو بن جائے گی۔"

اگر کوئی نیک عمل نہ کرے اور گناہ بھی نہ کرے تو بہتر ہے مثلاً زمین اگر خالی ہو تو اس سے بہتر ہے کہ تعمیر کرے اور پھر گرائے تو یہ مٹی اور خس و خاشاک سے پر زندگی گزار رہا ہے۔

جس طرح روایت کا مضمون ہے کہ کم عمل کرنا گناہ سے پرہیز کرنے سے ایسے

بہتر ہے جیسے طعام میں نمک۔ کتنا تھوڑا استعمال ہوتا ہے لیکن غذا کے خوش ذائقہ ہونے میں بڑا موثر ہوتا ہے۔

جو شخص گناہ سے پرہیز کرتا ہے اور صرف واجبات کی ادائیگی پر اکتفاء کرتا ہے تو یہ اس شخص سے کئی درجہ بہتر ہے جو ساری رات عبادت کرتا ہے لیکن گناہوں سے پرہیز نہیں کرتا۔

ان گزارشات سے معلوم ہوگیا کہ محرمات کا ترک کرنا اہم ہے۔ لہٰذا پہلے عبادت کی قبولیت کے لئے زمینہ ہموار کریں۔

رسول پاکؐ ماہ رمضان کے متعلق خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ حضرت علیؑ نے پوچھا:

اَیُّ الاَعْمَالِ اَفْضَلُ فِی ھَذَا الشَّھْرِ.

"یارسول اللہؐ اس ماہ میں کونسا کام بلند تر اور بہتر ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

اَلْوَرَعُ مِنْ مَحَارِمِ اللّٰہِ.

"سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس ماہ میں کوئی گناہ نہ کرے۔"

تقویٰ ایک ملکہ ہے

تقویٰ ایک باطنی ملکہ ہے جو زیادہ تکرار سے نفس میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ محرمات کے ترک کرنے اور ادائیگی واجبات کا نام ہے۔ جیسے کتابت کا ملکہ انسان میں زیادہ لکھنے کے تکرار سے ہوتا ہے' اس طرح انسان کے اندر آہستہ آہستہ ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کاتب بن جاتا ہے۔ البتہ ابتداء میں یہ مشکل ہوتا ہے لیکن تکرار کے بعد مزید قوت

کے پیدا ہو جانے سے آسان ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک جوان کے لئے پہلے نامحرم کی طرف نہ دیکھنا مشکل کام ہے۔ لیکن تکرار سے یہ کام آسان ہو جائے گا اور دور سے اگر نامحرم پر نگاہ پڑ گئی تو آنکھیں خود بخود بند ہو جائیں گی۔ پس جب تک انسان میں یہ قوت اور ملکہ پیدا نہ ہو جائے وہ کامل نہیں ہوتا۔ پس تمام واجبات اور محرمات میں کوشش کرنی چاہئے کہ یہ صفت پیدا ہو جائے۔

پرہیز گاروں کی صفات

نہج البلاغہ میں ایک خطبہ ہمام کے نام ہے جس نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے عرض کی کہ مولا! متقیوں کی صفات بیان فرمائیں؟ حضرتؑ نے ابتداء میں تو مختصراً فرمایا:

اِتَّقِ اللّٰهَ وَاَحسِن فَاِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ. هُمْ مُحْسِنُوْنَ.

"تو صاحب تقویٰ اور نیک ہو جا کیونکہ خدا پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔ اور وہی لوگ احسان مند ہیں۔"

ہمام اس جواب سے سیر نہ ہوا تو پھر حضرتؑ نے پورا خطبہ بیان فرمایا جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لہٰذا اب تکرار نہیں کرتے۔ صرف اس آیت کی مناسبت سے اس خطبے کے چند جملات کا تذکرہ کرتے ہیں:

"پرہیز گار ہی دنیا میں ہر فضیلت اور برتری کے مالک ہیں۔ ان کی زبان صحیح و سالم ہوتی ہے۔ (تہمت، جھوٹ، غیبت، فحش سے پاک) زندگی میانہ روی سے

گزارتے ہیں، فضول خرچی اور عیش پرستی سے دور رہتے ہیں۔ خضوع وخشوع سے رہتے ہیں جس کو خدا نے دیکھنا حرام قرار دیا ہے اس سے آنکھ چھپاتے ہیں۔ ایسی حکمت کو غور سے سنتے ہیں جو انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ یعنی لغو و بے ہودہ باتیں نہیں سنتے۔ اگر خدا کی طرف سے موت حتمی اور مقرر نہ ہوتی تو اب تک عذاب کے خوف کی وجہ سے ایک لحظہ بھی ان کے بدنوں میں جان نہ رہتی۔'' ان کے نزدیک خدا بہت بزرگ و برتر ہے۔ ان کے دل ہمیشہ غمگین رہتے ہیں۔ ان کے نفوس عفیف اور پاک ہوتے ہیں۔ یعنی کسی سے سوال نہیں کرتے، کسی سے لالچ وطمع نہیں رکھتے۔ ان کی طرف سے کسی کو اذیت نہیں پہنچتی۔ ان کی دنیاوی خواہشات کم ہوتی ہیں۔ اپنے بڑے اعمال کو بلند نہیں سمجھتے اور اس کے برعکس چھوٹے شر کو چھوٹا نہیں سمجھتے۔ رات کو عبادت اور تلاوت قرآن میں گزارتے ہیں۔ جب آیت رحمت کی تلاوت کرتے ہیں تو خدا سے رحمت، بخشش، مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور جب عذاب کی آیت تلاوت کرتے ہیں تو خدا سے پناہ مانگتے ہیں۔ کثرت رکوع سے وہ کمر خمیدہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے روز وشب علم کی طلب میں گزاتے ہیں۔ اور اپنے اندر پسندیدہ صفات پیدا کرتے ہیں۔ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ مریض ہیں حالانکہ یہ بیمار نہیں ہوتے بلکہ ایک بڑی چیز نے ان کو مصروف کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ جہنم کی آواز سنتے ہیں۔ جیسے ارشاد قدرت ہے کہ ان کو بہشت کا ایسا یقین ہوتا ہے کہ گویا اس بہشت میں ابھی موجود ہیں۔ اور جہنم پر ایسا یقین رکھتے ہیں گویا کہ اس کو دیکھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو معذب سمجھتے ہیں۔''

لوازم تقویٰ

تقویٰ کے کئی درجے ہیں۔ جس کا تقویٰ زیادہ ہے اس کی عزت خدا کے

نزدیک زیاد ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰیکُم یہ تقویٰ انسان کو مقام صدق تک لے جاتا ہے۔ جس قدر تقویٰ زیادہ ہوتا ہے اسی قدر صدق زیادہ ہوتا ہے۔ صدق یقین کے قریب تر، حتی کہ رب العالمین کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

تقویٰ کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ سختیوں سے نجات ملتی ہے اور رزق حلال ملتا ہے۔ سورہ طلاق میں ارشاد ہے:

وَمَنْ یَّتَقِ اللّٰہَ یَجْعَلَ لَہٗ مَخْرَجًا وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِب وَمَنْ یَّتَوَکَّل عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ اِنَّ اللّٰہَ بَالَغَ اَمْرَہٗ

''جو انسان تقویٰ اختیار کرے، تو خدا اس کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے کہ وہ سختی سے نمٹ سکتا ہے۔ اور رزق بھی ایسے مقام سے دیتا ہے جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ پس جو شخص بھی خدا پر توکل کرے تو خدا اس کے لئے کافی ہے اور اس کے معاملے کو حل کرتا ہے۔''

ابن فہد حلیؒ اپنی کتاب عدۃ الداعی میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت چند امور پر دلالت کرتی ہے۔

تقویٰ ایسا مناسب قلعہ اور ایسی محفوظ غار ہے جو خدا کے فرمان کے مطابق وَیَجْعَلُ لَہٗ مِخْرَجاً ایسے ہے جیسے پیغمبر اکرم کا فرمان ہے کہ آسمان اور زمین بندے پر بند ہو جائیں، تو پھر اگر وہ پرہیزگار ہے تو خدا آسمان اور زمین سے اس کے لئے خرچ اور (مصیبت سے) نکلنے کے راستے بنا دیتا ہے۔

۲۔ تقویٰ بہت بڑا خزانہ ہے جیسے ارشاد رب العزت ہے۔ وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ.

۳۔ فضیلت توکل پر دلالت کرتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ توکل کے لئے ضمانت دیتا ہے کہ۔ ''فَهُوَ حَسْبُهٗ'' اس کے لئے خدا کافی ہے۔ کون ہے جو خدا سے زیادہ سچا ہو وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا۔ اس لئے پیغمبرؐ نے فرمایا: کہ ''اگر لوگ اس آیت کو یاد کرلیں تو یہی آیت ہمیشہ ان کے لئے کافی ہے۔''

۴۔ اللہ کی تعریف بندوں کے لئے یہ ہے کہ وہ جو ارادہ فرمائے اس پر قادر ہے' کوئی چیز اس کو عاجز نہیں کرسکتی۔ کوئی مطلوب اس کے ارادہ کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ فرماتا ہے کہ ان اللّٰہ بالغ امرہ. اللہ ان کے لئے کافی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ پیغمبر نے ارشاد فرمایا:

خدا فرماتا ہے مجھے اپنی عزت و جلال' عظمت و کبریائی' نور اور بلندی کی قسم کہ جس نے میری مرضی پر اپنی مرضی کو چن لیا اس کا معاملہ بکھیر دوں گا' اس کے دل میں دنیا کی محبت آجائے گی اور وہی کچھ روزی دوں گا جو اس کے لئے مقدر کی ہے۔ اور اپنی عزت و جلال' عظمت و کبریائی' نور و بلندی کی قسم جس نے میری مرضی کو اپنی مرضی پر چن لیا تو اس کی میرے ملائکہ حفاظت کرتے ہیں' اور زمین و آسمان اس کے رزق کے ضامن ہیں' اس کی تجارت میں برکت ڈالوں گا'' (جو نفع میں دوں گا وہ تجار کے منافع سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اور اسے ایسی آخرت دوں گا کہ اس کے سامنے دنیا ذلیل ہوگی۔)

ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریمؐ سے اس وقت سنا ہے جب آپ اُحد سے واپس تشریف لائے۔ آپؐ کے اردگرد لوگ جمع تھے۔ آپؐ نے

ایک درخت کی ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ آپؑ نے فرمایا:

اے لوگو! جس کی تمہیں تکلیف دی گئی ہے، یعنی آخرت کی اصلاح کی طرف توجہ کرو اور جو دنیا میں تمہیں ضمانت دی گئی ہے اس کی طرف توجہ کرو۔ اعضاء و جوارح کو جو اس کی نعمتوں سے کامل ہوئے ہیں، گناہوں میں نہ ڈالو کہ یہ گناہ اس کی ناراضگی کا سبب ہیں۔ اس سے اس کی نعمتوں کو طلب کرو اور اس کی اطاعت میں خرچ کرو۔ جو دنیا کا حصہ مانگے گا تو اس کے لئے آخرت میں حصہ نہ ہوگا۔ دنیا میں کچھ نہ ملے گا اور جو پہلے آخرت کے لئے حصہ مانگے تو اس کو دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی ملے گا۔

عبداللہ بن سنان حضرت امام جعفر صادق سے روایت کرتے ہیں: آپؑ نے فرمایا:

''جو مومن خدا سے مانگے خدا جو چاہتا ہے اس کو وہی دیتا ہے کیونکہ خدا کی مرضی یہی تھی، اور جو اپنے تقویٰ سے خدا سے تمسک کرے تو خدا اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور جو بھی خدا کی طرف آئے خدا اس کو قبول کرتا ہے، اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر آسمان زمین پر گر جائے تو بھی اس کو خوف نہیں اور اگر (دوسرے) اہل زمین پر کوئی عذاب بھی آجائے تو وہ خدا کی پناہ میں ہے۔''

کیونکہ خدا نے فرمایا:

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِی مَقَامٍ اَمِیْنٍ.

''متقی لوگ مقام امن میں ہیں۔''

تقویٰ کی برکت سے مقام ہلاکت میں حفاظت

محمد بن یعقوب نے صحیح سند کے ساتھ اسحاق بن عمار سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ تھا' اس کا ایک قاضی تھا' اس قاضی کا بھائی بہت صادق اور سچا تھا' اس کی عورت ایسی تھی جس سے انبیاء پیدا ہوئے۔ بادشاہ نے ایک شخص کو کہیں بھیجنے کا ارادہ کیا تو قاضی سے کہا کہ کوئی باعتماد آدمی بلاؤ۔ قاضی نے کہا کہ اپنے بھائی سے زیادہ باعتماد اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کو بلایا تاکہ بھیجے لیکن اس نے جانے سے انکار کیا کیونکہ یہ مجھے ناپسند ہے کہ بیوی کو اکیلا چھوڑ جاؤں۔ قاضی نے مبالغہ کیا تو وہ جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے قاضی سے کہا:

میں کسی چیز کو اپنے پیچھے نہیں چھوڑتا' پس تو میرا قائم مقام ہے۔ قاضی نے کہا: ٹھیک ہے۔ وہ چلا گیا لیکن اس کی بیوی اس کے جانے پر راضی نہ تھی۔ قاضی بھائی کے گھر آتا اور ضرورت حاجت پوچھ کر چلا جاتا لیکن وہ اس عورت کے حسن پر فریفتہ ہو گیا۔ ایک دفعہ اس نے عورت کو برائی کی دعوت دی' تو اس نے انکار کیا۔ قاضی نے قسم اٹھائی کہ اگر تو نے میری بات نہ مانی تو میں بادشاہ کو اطلاع کر دوں گا کہ اس نے زنا کیا ہے۔ عورت نے کہا جو کرنا ہے کرو کبھی بھی برائی نہیں کروں گی'

قاضی نے بادشاہ کو شکایت کی کہ میری بھابھی نے زنا کیا ہے جو ثابت بھی ہو چکا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اس عورت کو اس گناہ سے پاک کرو۔ قاضی اس عورت کے پاس آیا اور اس نے عورت سے کہا کہ بادشاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تجھے سنگسار کیا جائے' اب کیا کہتی ہے۔ اب بھی وقت ہے بات مان لے' ورنہ سنگسار کروں گا۔ اس عورت نے

کہا جو کرنا ہے کر و میں تیری بات نہیں مانتی ۔ قاضی اس کو باہر لایا' گڑھا کھودا گیا۔ اس کو سنگسار کر دیا گیا۔ جو لوگ قاضی کے ساتھ تھے انہوں نے خیال کیا کہ اب وہ عورت مر گئی ہے۔ اس کو مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے ۔ رات ہوئی ابھی اس عورت میں جان کر رمق باقی تھی ۔ اس نے اپنے آپ کو اس گڑھے سے نکالا اور چل پڑی ۔ شہر سے دور ایک دیر راہب کے پاس پہنچی ۔ اس کے دروازہ پر سو گئی ۔ صبح کو جب راہب نے دروازہ کھولا ۔ عورت کو دیکھا' حال پوچھا۔ عورت نے اپنا حال بتایا۔ اس راہب کا ایک بچہ تھا اس نے سمجھا کہ عورت کے احوال اچھے تھے ۔ اس نے عورت کا علاج کیا تو وہ ٹھیک ہو گئی ۔ زخم مندمل ہو گئے ۔ پھر اس کو اپنا بچہ دیا کہ وہ اس کی تربیت کرے ۔

اس راہب کا ایک وکیل تھا جو اس کے پاس کام کرتا تھا۔ اس کی توجہ اس عورت کی طرف مبذول ہو گئی ۔ اس نے برائی کی دعوت دی' عورت نے انکار کیا ۔ جس قدر اس نے کوشش کی عورت نے ٹھکرا دیا ۔ آخر اس نے بھی دھمکی دی کہ اگر میری بات نہ مانے گی تو تجھے قتل کرا دوں گا ۔ عورت نے کہا جو چاہے کر لے' میں تیری بات ہرگز نہیں مانوں گی ۔

پس اس شخص نے اس بچے کی گردن توڑ دی اور راہب کے پاس آیا کہ یہ عورت مجھے زنا پر دعوت دیتی ہے' جو فاجرہ ہے ۔ اس نے مجھ سے زنا کرنے پر اصرار کیا' میں نے تیرا بچہ اسے دیا تو اس عورت نے تیرے بچے کو مار دیا ۔ راہب عورت کے پاس آیا اور کہا یہ تم نے کیا کر دیا حالانکہ میں نے تجھ سے بڑی نیکی کی تھی ۔ اس عورت نے پورا واقعہ بتایا ۔ راہب نے کہا اب تو یہاں سے چلی جا تیرا یہاں پر رہنا خلافِ مصلحت ہے' اسی رات باہر نکال دیا اور اس کو ۲۰ درہم دیئے کہ یہ تیرا زادِ راہ ہے اور تیرے لئے خدا کافی ہے ۔

عورت رات کو چلتے چلتے صبح کے قریب ایک بستی کے قریب پہنچی۔ یہاں دیکھا کہ ایک شخص کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے اور وہ زندہ ہے۔ اس کا حال پوچھا' اس کو بتایا گیا کہ یہ ۲۰ درہم کا مقروض ہے۔ ہمارا قانون ہے کہ قرض لینے والا مقروض کو سولی پر لٹکا دے یا قرضہ ادا کرے۔ تو اس عورت نے ۲۰ درہم نکالے اور قرض خواہ کو دیئے اور کہا اس کو قتل نہ کرو' تو اس کو سولی سے اتار دیا گیا۔

اس شخص نے عورت سے کہا: کسی نے تم سے زیادہ مجھ پر احسان نہیں کیا۔ مجھے اس سولی اور موت سے نجات دی گئی۔ میں تیرے ساتھ ہوں تو جہاں بھی جائے گی۔ دونوں چلتے رہے۔ ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ کچھ لوگوں کو چند کشتیوں کے ساتھ دیکھا۔ اس مرد نے کہا: تم یہاں بیٹھو اور میں وہاں جا کر کام کرتا ہوں اور کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اور تمہارے پاس کھانا لاؤں گا۔ وہ مرد ان لوگوں کے پاس گیا۔ اور کہ تمہاری کشتیوں میں کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تجارت کا سامان ہے۔ جواہر وغیرہ ہیں اور یہ کشتی ہماری اپنی ضرورت کے لئے ہے۔ اس نے کہا کہ اس کشتی کی قیمت کیا ہے؟ انہوں نے کہا اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ تم شمار بھی نہیں کر سکتے۔

اس نے کہا: کہ میرے پاس بھی بہت قیمتی چیز ہے۔ جو تمہاری کشتیوں کے سامان سے بہتر ہے۔ انہوں نے کہا کونسی چیز ہے؟ ایک خوبصورت کنیز ہے کہ آج تک اتنی حسین نہ دیکھی ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ اس کنیز کو بیچو گے؟ اس نے کہا ''ہاں ایک شرط کے ساتھ کہ تم میں سے بعض لوگ وہاں جائیں' اس کو دیکھیں پھر میرے پاس آئیں اور مجھ سے خریدیں'' لیکن اس کنیز کو نہ بتائیں اور اس کی قیمت مجھے دیں تاکہ میں چلا جاؤں۔ انہوں نے کہا: ''ہمیں قبول ہے۔'' ایک شخص کو بھیجا' اس نے دیکھا اور کہا کہ ایسی خوبصورت عورت تو کبھی نہیں دیکھی۔ چنانچہ وہ حسین و جمیل عورت ہزار درہم

پر خریدی گئی' اس شخص نے رقم لی اور چلا گیا۔ جب وہ بہت دور چلا گیا تو وہ عورت کے قریب آئے اور کہا: اٹھو اور کشتی پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے کہا: کیوں؟ انہوں نے کہا: تجھے تیرے مالک سے خریدا گیا ہے۔ اس نے کہا: وہ میرا مالک نہیں ہے' انہوں نے کہا: اٹھے گی یا ہم خود تجھے اٹھا کر لے جائیں؟ وہ عورت خود اٹھی اور ان کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ جب دریا کے کنارے پہنچے۔ (چونکہ وہ ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرتے تھے) تو انہوں نے عورت کو سامان والی کشتی پر سوار کیا اور خود دوسری کشتی میں سوار ہو گئے۔ خدا نے طوفان بھیج دیا۔ وہ کشتی کے ساتھ غرق ہو گئے۔ اور سامان والی کشتی نجات پا گئی' جس میں وہ عورت تھی' حتی کہ دریا کے کسی جزیرہ میں پہنچی۔ اس عورت نے کشتی کو باندھا اور خود جزیرہ میں چلی گئی۔ عورت نے اس جزیزہ میں پانی اور میوہ دار درخت پائے۔ اپنے آپ سے کہا کہ یہ پانی ہے پی لوں اور یہ میوے چن کر کھالوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی اسی جگہ پر عبادت بجالاؤں۔

خداوند متعال نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے کسی نبی کو وحی کی کہ اس بادشاہ (قاضی والا) کے پاس جاؤ اور اس کو کہو کہ فلاں جزیرہ میں اپنی رعایا کے ساتھ جاؤ۔ اور اس عورت کے پاس جا کر اپنے گناہوں کا اقرار کرلو اور اس سے معافی مانگو' اگر اس نے معاف کر دیا تو میں بھی معاف کر دوں گا۔

بادشاہ نے اپنی رعایا کے ساتھ اس عورت کو دیکھا' آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ یہ قاضی میرے پاس آیا' اس نے مجھے خبر دی کہ میری بھابھی نے زنا کیا ہے۔ میں نے سنگسار کا حکم دیا حالانکہ میرے پاس گواہ نہ تھا۔ میں ڈرتا ہوں کہ میں ایسا کام کر بیٹھا ہوں جو میرے لئے جائز نہ تھا۔ آپ خدا سے میرے لئے معافی طلب کریں' اس عورت نے کہا: کہ خدا تجھے معاف کر دے گا۔ ادھر بیٹھ جاؤ۔ پھر اس عورت کا شوہر (جو سفر پر گیا

تھا) سفر سے واپس آیا' اس نے اپنی بیوی کو نہ پہچانا' اس نے کہا میری بیوی ایک نیک' صالح اور پاکدامن عورت تھی۔ میں سفر پر تھا' وہ میرے جانے پر راضی نہ تھی' اب میرے بھائی نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے زنا کیا تھا۔ اور ہم نے اس کو سنگسار کر دیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاید اس کے بدکار ہونے کا سبب میں بنا ہوں۔ آپ میرے لئے استغفار کریں تاکہ خدا مجھے معاف کر دے۔ اس نے کہا: خدا تجھے معاف کرے۔ ادھر بیٹھ جاؤ۔ وہ بھی بادشاہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر وہ قاضی آیا اور اس نے کہا میرے بھائی کی بیوی تھی' میں نے اس کو برائی کی دعوت دی۔ اس نے انکار کیا تو میں نے بادشاہ کو بتایا کہ اس عورت نے زنا کیا ہے۔ اس نے سنگسار کا حکم دیا' میں نے اس کو سنگسار کر دیا حالانکہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرے لئے خدا سے معافی طلب کرو کہ خدا مجھے معاف کرے۔ پھر عورت نے اپنے شوہر کی طرف منہ کر کے کہا کہ غور سے سنو! اس نے کہا کہ خدا تجھے معاف کر دے گا۔

پھر راہب آیا اس نے اپنا حال سنایا کہ میں نے عورت کو رات اپنے دیر سے نکالا۔ ڈرتا ہوں کہ کسی درندے نے اس کو مار دیا ہو۔ عورت نے کہا: خدا تجھے معاف کر دے گا۔

پھر وہ اس راہب کا وکیل آیا۔ اپنا حال سنایا تو عورت نے راہب کو کہا کہ اب اس کی بات غور سے سنو۔ اور پھر کہا اے وکیل! خدا تجھے معاف کر دے گا۔

پھر وہ شخص آیا جس کو سولی پر لٹکایا جا رہا تھا اس نے اپنا محسن کشی کا واقعہ سنایا' عورت نے کہا خدا تجھے بھی معاف کرے۔ پھر شوہر کی طرف منہ کر کے کہا کہ میں تیری بیوی ہوں۔ یہ جو سب نے واقعہ سنایا ہے میری آپ بیتی ہے۔ مجھے اب مردوں کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ کشتی اور اس میں موجود سامان لے جاؤ۔ اور مجھے

یہاں چھوڑ دو کہ میں اللہ کی عبادت اسی جزیرہ میں کرتی رہوں' آپ نے دیکھا کہ مجھے مردوں کی طرف سے کتنی تکلیف ہوئی ہے۔ پس شوہر نے اس کی بات قبول کی۔ کشتی اور اس کا سامان لیا اور بادشاہ اپنے ان اہل مملکت کے ساتھ واپس آیا۔

پس اس عورت کا تقویٰ دیکھیں' اللہ تعالیٰ نے کس طرح تین مشکل مراحل سے اس کو باعافیت تقویٰ سے گزارا' سنگسار' تہمت وکیل اور تاجروں کی کنیزی سے کیسے نجات دی' پھر غور کریں کہ خدا نے اس کو کیسی کرامت عطا فرمائی کہ اپنی رضا کو اس کی رضا کے ساتھ ملایا۔ اپنی بخشش کو اس کی بخشش سے ملادیا۔ جن لوگوں نے اس عفیفہ کے لئے زحمت اور تکلیف کے اسباب بنائے ان کو کیسے اس عورت کے سامنے ذلیل و رسوا کیا کہ ان سب نے اس سے معافی مانگی۔ کس قدر اس کی منزلت کو بلند اور ذکر کو عظیم بنایا کہ اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ بادشاہوں' قضات اور عباد کو اس کی طرف بھیجو اور اس کو اپنا باب بنایا؟

حرام سے پرہیز کیا اور حلال سے فائدہ اٹھایا'

روایت میں ہے کہ زرعہ بن محمد مدینہ کا رہنے والا تھا۔ اس کی ایک نفیس کنیز تھی کہ کسی مرد کے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی۔ وہ اس کا عاشق ہو گیا اور اس نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے شکایت کی۔ حضرت نے فرمایا کہ جب اس کو دیکھو یہ کہو کہ اَسْئَلُ اللّٰهِ مِنْ فَضْلِهِ مِنْ فَضْلِهِ اس نے ایسا کیا: کچھ عرصہ گزرا تو اس کنیز کے مالک کو سفر پر جانا پڑ گیا' تو وہ اس مرد (عاشق) کے پاس آیا اور اس نے کہا' کہ آپ میرے ہمسایہ ہیں میرے بڑے معتمد ہیں۔ میں نے سفر پر جانا ہے میں چاہتا ہوں کہ فلاں کنیز آپ کے پاس امانت رکھوں۔ اس شخص نے کہا کہ میری بیوی نہیں تو کس طرح

اس کو میرے گھر میں رکھے گا۔

اس نے کہا: میں اس کو تمہیں بیچتا ہوں تا کہ تیرے پاس رہے جب میں واپس آؤں تو آپ مجھے پھر اسی قیمت پر بیچ دینا' میں خرید لوں گا۔ تا کہ اس کا تمہارے پاس رہنا شرعی طریقہ سے ہو' لہٰذا اس نے اس کنیز کو بھاری رقم سے خریدا'

وہ مرد مسافرت پر چلا گیا اور وہ کنیز اس جوان کے پاس آ گئی۔ اس نے اس سے جی بھر کر لذت اٹھائی۔ اسی دوران خلفائے بنی امیہ کا کوئی قاصد آیا کہ اس کے لئے کنیزیں خرید لے۔ اور خصوصی طور پر اس کنیز کا نام لیا گیا تھا کہ اس کو بھی خریدنا ہے قاصد اس کے پاس آیا اس نے کہا کہ فلاں کنیز تمہارے پاس ہے؟ اس نے کہا کہ وہ شخص تو سفر پر ہے۔ بس حاکم نے زبردستی وہ کنیز خریدی۔ اس کنیز کو خرید کر وہ شہر سے باہر لے گیا' تو اس کا مالک آ گیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی کنیز کا حال پوچھا۔ اس جوان نے پورا قصہ سنایا اور جو رقم اس کنیز کے بدلے لی تھی وہ لایا اور کہا کہ یہ تمہاری کنیز کی رقم ہے۔ مالک نے انکار کیا کہ میں زیادہ رقم نہیں لوگا۔ بلکہ اتنی رقم لونگا جتنے پر تجھے بیچی تھی۔ اور اس سے زیادہ جو مال ہے وہ تیرا ہے۔ پس خدا نے اس جوان سے یہ نیکی کی کیونکہ اس کی نیت نیک تھی۔ حرام سے بچتا تھا۔

پسندیدہ مقام

آیہ مذکورہ پر بحث جاری تھی چونکہ یہ آیت اہمیت کی حامل ہے۔ لہٰذا مزید اس پر بحث کی جائے گی:

فِیُ مَقُعِدِ صِدُقٍ.

مقعد صدق کیا ہے؟ مقعد اسم مکان ہے۔ جس کے معنی مقام قرار کے ہیں۔ یعنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں۔ صدق ہر پاک اور پسندیدہ چیز کو کہا جاتا ہے۔ اور مقعد کا صدق کی طرف مضاف ہونے کی کئی وجوہات بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ موصوف صفت کی طرف مضاف ہے۔ یعنی مجلس حق' پسندیدہ مکان اور صحیح و سالم قرارگاہ وہ ہے جس میں فسق وفجور اور گناہ نہ ہو۔ ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ متقی لوگ آخرت میں ایسے عظیم مقام پر ہونگے ' جو حقیقت میں رہنے کی جگہ ہوگی۔ مختصراً اہل تقویٰ آخرت میں ایسے محل پر ہونگے کہ صحیح طور پر رہنے' بیٹھنے اور قرار پکڑنے کی جگہ ہوگی۔ چونکہ اس میں نامناسب چیز کوئی نہیں ہو گی اور زوال بھی اس دنیا میں نہ ہوگا کیونکہ یہ اس مقام ارجمند کے خلاف ہوگا۔ یہ دنیا تو قرار کی جگہ ہے ہی نہیں' کیونکہ ایک تو اس دنیا میں آفات اور مختلف مشکلات ہیں۔ اور دوسرے ہمیشہ رہنے کی جگہ بھی نہیں ہے' بلکہ اس میں کچھ وقت گزار کر اپنے اصلی وطن کی

طرف پلٹ جانا ہے۔ دنیا اگرچہ خوبصورت ہے لیکن چونکہ اس سے کسی وقت نکالا جائے گا لہٰذا یہ استراحت کے قابل نہیں ہے۔

سببی اضافت

دوسری وجہ سببی اضافت ہے۔ خدا ان کے صدق کی وجہ سے ان کو اپنے قرب میں جگہ دے گا۔

تفسیر منہج الصادقین میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

> ''چونکہ خدا تعالیٰ نے اس مقام کی صدق سے تعریف کی ہے لہٰذا اس مقام پر اہل صدق کے علاوہ کوئی اور نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ صدق مقامِ قرب تک پہنچنے کا واحد وسیلہ اور راستہ ہے۔''

خدا کا دوست

دارالسلام عراقی کتاب کے آخر میں نجف اشرف کے ایک عبد صالح سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے مومن بھائیوں کی خدمت میں مصروف تھا اور میں نے فقراء اور غرباء کی تجہیز و تکفین اور زائرین کی ضرورت کے لئے خصوصی تاکید کی تھی۔ ایک رات گھر میں سویا ہوا تھا کہ میں نے ایک شخص کو خواب میں دیکھا۔ اس نے کہا کہ ایک دیندار آدمی فلاں حمام کی آگ جلانے کی جگہ پر فوت ہو گیا ہے۔ جاؤ اور اسے اٹھاؤ۔ میں فوراً بیدار ہوا تو آدھی رات کا وقت ہو چکا تھا۔ زمانہ پرخطر تھا' دل میں خیال آیا کہ باہر جاؤں تو کسی حادثہ کا شکار ہو جاؤں گا۔ دوسری بات یہ کہ خواب ہے ضروری نہیں کہ سچا ہو' لہٰذا میں یہ سوچ کر پھر سو گیا۔ جب نیند آئی تو دوبارہ وہی شخص

آیا اور پہلے والی بات کی' میں نے پھر وہی بہانہ بنا کر اپنے آپ کو مطمئن کیا اور پھر سو گیا۔ تیسری دفعہ پھر وہی خواب آیا' اس دفعہ میں نے سستی کرنا مناسب نہ سمجھا' اپنے بیٹے کو اٹھایا' چراغ روشن کیا اور ہم اس حمام کی طرف گئے اور آگ جلانے والی جگہ پہنچے۔ بہت دیکھا لیکن کچھ نہ پایا۔ بڑی جستجو کے بعد راکھ کے اوپر ایک چیز دیکھی۔ جو انسانی سر سے مشابہ تھی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص ہے جو سخت سردی کی وجہ سے راکھ میں دبا ہوا ہے اور اس نے سر کو راکھ سے باہر سانس لینے کے لئے نکالا ہوا تھا۔ اور اسی حالت میں وہ فوت ہو گیا۔ پس ہم نے اس کو اس ذلت آمیز جگہ سے نکالا۔ اس کی حالت زار پر نہایت دکھ ہو رہا تھا' ہم نے اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا: اے بندہ خدا تجھے اللہ رب العزت کی قسم جس نے مجھے اترا دوست قرار دیا اور صبح تک تجھے اس حال میں نہ دیکھ سکا' یہ مقام تو نے کیسے حاصل کیا؟ میں نے ایک غائبانہ آواز سنی کہ کوئی کہہ رہا تھا: میں نے سچائی کے ذریعے سے نجات پائی ہے۔ پس ہم نے اس کی تجہیز و تکفین انجام دی اور اسے سپرد خاک کیا۔

سچائی اور صدق کی وجہ سے درجات بلند

ان آیات و روایات سے جو صدق کے بارے وارد ہوئی ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے بھی معنوی درجات حاصل کئے ہیں سچائی ہی کی بدولت کئے ہیں۔ جس کا صدق زیادہ ہے اس کا مرتبہ بھی زیادہ ہے حتی کہ اس طرح وہ صدق مطلق کے مقام پر جا پہنچتا ہے۔ اور اس کو صدیق کہتے ہیں۔ جو پیغمبروں اور آئمہ علیہم السلام کا مقام ہے۔

جیسا کہ بحار الانوار جلد نمبر ۷ میں علامہ نے ذکر فرمایا ہے۔ کہ صدق' صادق' صدیق اور صادقین سے مراد آل محمدؐ ہیں کے بارے میں باب قائم کیا

ہے۔اب جبکہ صدق کی اہمیت معلوم ہو چکی تو اس کے مراتب کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے تا کہ مقام صدق کے حصول کے لئے ترغیب کا باعث ہو۔

مراتب صدق اور اس کی اقسام

صدق کے کئی مرتبے ہیں جو ان تمام مراتب پر فائز ہو اس کو صدیق کہتے ہیں۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ الرَّجُلَ لِيَصدُقَ حَتّٰی يَكْتُبَهُ اللّٰهُ صَدِيقًا.

''جو شخص صدق کو اپنا شعار بنا لیتا ہے وہ خدا کے نزدیک صدیق شمار ہوتا ہے۔''

خداوند متعال نے قرآن مجید میں صدیقین کو شہداء کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

فَأُولٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ.

''تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے کہ بعض نبیوں میں سے ہیں، اور بعض صدیقوں میں سے، اور بعض شہداء میں سے اور بعض صالحین میں سے ہیں۔''

اور اپنے بزرگ پیغمبروں مثلاً ابراہیم علیہ السلام کو صدیق کہا، اَنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا۔ ہر شخص کو اپنے اس صدق کی وجہ سے قیامت کے دن فائدہ ہوگا۔

گفتار میں صدق

علمائے نے صدق کی چھ قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) صدقِ گفتار، اس کی دو قسمیں ہیں۔ صدق با خلق اور صدق با خالق، مخلوق سے سچائی یہ ہے کہ جو کہے سچ کہے۔ بغیر ضرورت کے ''توریہ'' بھی نہ کرے اور ''توریہ'' یہ ہے کہ ظاہراً جھوٹ ہو۔ لیکن باطناً صحیح معنی مراد ہوں، مثلاً کوئی کہتا ہے رقم نہیں ہے، ارادہ یہ ہے کہ ہاتھ میں نہیں، یا جیب میں نہیں۔ اور جس بات کا یقین نہ ہو وہ نہ کہے، یا کہے تو گمان اور احتمال کی قید سے کہے۔ یعنی ''میرا گمان ایسا ہے'' ''مجھے یہ احتمال ہے۔'' اس احتمال و گمان کی قید کے بغیر نہ بولے نہ لکھے جب تک کہ یقین نہ ہو جائے۔ حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَبْعَثْ نَبِیًّا اِلَّا بِصِدْقِ الْحَدِیْثِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَۃِ اِلَی الْبِرِّ وَالْفَاجِرِ.

''خدا نے کسی پیغمبر کو بغیر سچائی کے نہیں بھیجا۔ اور امانت میں خیانت نہیں کرنی چاہیے خواہ امانت نیک شخص کی ہو یا برے کی۔''

چنانچہ امامؑ فرماتے ہیں:

لَا تَنْظُرُوْا اِلٰی طُوْلِ الرُّکُوْعِ الرَّجُلِ وَسُجُوْدِہٖ فَاِنَّ ذٰلِکَ قَدْ اِعْتَادَہٗ فَلَوْ اِسْتَوْحَشَ لِذٰلِکَ وَلٰکِنْ اُنْظُرُوْا اِلٰی صِدْقِ حَدِیْثِہٖ وَاَدَاءِ اَمَانَتِہٖ.

''کسی کے لمبے رکوع و سجود سے دھوکہ نہ کھاؤ اس کو لمبی نمازوں کی وجہ سے دین دار مت سمجھ بیٹھو، کیونکہ ممکن ہے اس کا یہ لمبی نماز پڑھنا اس کی عادت ہو یعنی اگر نماز لمبی نہ پڑھے تو ناخوش ہونا ہو بلکہ اس کو اپنی بات میں سچا ہونے اور امانت کے صحیح واپس پلٹانے میں پرکھو۔''

مختصراً کلام میں سچائی، امانت داری، خداپرستی اور ایمانداری کے شواہد ہیں۔ اور حدیث نبوی میں صدق کو ترک کرنا گویا کہ اس کو نفاق شمار کیا گیا ہے۔

گفتار میں صدق باخالق

عبادات اور مناجات میں کوشش کرے کہ اپنے رب سے سچائی سے بات کرے۔ مثلاً جب اعوذ باللہ من الشطین'' کہہ رہا ہو تو واقعی شیطان سے دور ہونے اور پروردگار کی طرف آنے کا ارادہ ہو۔ مثلاً اللہ اکبر کہتے ہوئے اللہ کو سب سے بڑا سمجھے' دنیا، شہوت اور منصب کو بڑا نہ سمجھے' مثلاً اگر اسے کہا جائے کہ فلاں برا کام چھوڑ دے یا فلاں اچھا کام کرلے تو وہ توجہ ہی نہ کرے۔ لیکن اگر کسی سے ڈرتا ہے یا کچھ رقم اس کو دیتا ہے' کوئی رشوت کا وعدہ کیا ہے تو فوراً اس کا کام کردے یا چھوڑ دے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اللہ اکبر کہتے وقت تمام مخلوقات فرش تا عرش کو خدا سے بہت چھوٹا سمجھے۔ اگر اللہ اکبر کہتے وقت' یہ حالت نہ ہو تو خدا فرماتا ہے۔ اے جھوٹا مجھے دھوکہ دیتے ہو۔ مجھے اپنے جلال اور عزت کی قسم تجھے اپنے ذکر اور مناجات کی شیرینی سے فائدہ نہ دوں گا۔''

اس طرح الحمد للہ کہتے وقت ہر چیز جو بہت بڑی ہو یا ایک عظیم نعمت ہو' اس کو خدا کا مرہون منت سمجھے اس ذات وحدہٗ لاشریک کی مدح سرائی پر انحصار کرے۔ اور سبحان اللہ کہتے وقت وہ چیز جو اس کے لئے جائز نہیں اس سے پاک سمجھے۔

اور لا الہ الا اللہ کہتے وقت اس کے غیر کو عبادت کے لائق نہ سمجھے۔ اور استغفر اللہ کہتے وقت اپنے گذشتہ گناہوں سے پشیمان اور آئندہ نیکی پر عازم ہو' اسی طرح

ایاک نعبدو وایاک نستعین کہتے ہوئے صرف اسی کی عبادت کرے اور صرف اس سے مدد مطلب کرے۔ اسی طرح تمام کلمات دعا و مناجات میں واقعی اپنا تصور بھی وہی رکھے۔ ذہنی کلام میں سچ ہو۔ مثلا اگر کہے کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں یا اس کی رحمت کا امیدوار ہوں اس بات میں سچا ہو۔ اور خدا سے ڈرنے کی سچائی کی نشانی یہ ہے کہ گناہ سے دور رہے اور رحمت کی امید کی سچائی کی علامت عبادت و طاعت کی کوشش میں ہے اگر چہ اکثر اہل ایمان ان کلمات کو کہتے ہوئے صدق کے بعض مراتب سے محروم نہیں ہیں لیکن اپنے عمل بر راضی ہو کر غرور اور تکبر میں نہ آجائے بلکہ کوشش کرے کہ مرتبہ صدق پر فائز ہو اور خود کو خدا کے نزدیک شرمسار اور غیر مستحق سمجھے۔ اس مطلب کا اعتراف کرے اور ہمیشہ اس سے طلب عفو کرے، اور معافی مانگے۔

جب دعا قبول نہ ہو اور حاجت حل نہ ہو یا خود کو قرب خدا کے مرتبہ سے محروم دیکھے تو کہے: اے پروردگار! مجھے تو نے میرے جھوٹ کی وجہ سے رحمت سے دور کر دیا یا مجھے ناشکری کی وجہ سے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے، اس کے فضل و کرم کا ملتجی ہو اور اپنے حال کی اصلاح اس سے طلب کرے۔ یہ خلاصہ صدق گفتار باخلق و خالق کا تھا۔

نیت کی سچائی

یعنی عبادت و طاعات میں محرک اور داعی فقط خدا ہو، اس کے علاوہ کوئی چیز مقصود و مطلوب نہ ہو۔ البتہ حقیقت نیت ذہنی فکر یا زبان سے جاری کرنا نہیں ہے کہ ذہن میں رکھے یا زبان سے کہے کہ نماز پڑھتا ہوں۔ قُرْبَةً اِلَی اللّٰہِ.

بلکہ حقیقت نیت وہی ہے جو پلان اور توجہ قلب سے ہو اور وہی قلبی ارادہ ہے پس اگر ارادہ میں غیر خدا ہو مستقلاً یا اشتراکاً تو یہ صادق نہیں اور اس کا عمل بھی باطل ہے۔

فعل اختیار کے مقدمات

جب کوئی شخص اپنے اختیار سے کوئی کام کرتا ہے تو ابتداء میں اس کے فائدے یا نتیجہ کا تصور کرتا ہے جب اس کام کا فائدہ سمجھ لیتا ہے' تو اس کے دل میں اس فائدہ تک پہنچنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔تو پھر اس عمل کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ جو اس کام کو کرتا ہے۔خلاصہ اختیاری عمل کے چار مقدمے ہیں:

تصور تصدیق بے فائدہ' شوق اور ارادہ۔

اس مطلب کے واضح ہونے کے بعد ہم یوں کہتے ہیں کہ وہ فائدہ جو شوق اور ارادہ کے پیدا ہونے کا سبب بنا' اگر وہ عمل اخروی اور خدائی ہو تو وہ عمل خالص اور صحیح ہے۔ اور اگر فائدہ دنیاوی اور نفسانی ہو تو وہ عمل ریاکاری' باطل اور گناہ ہے خواہ زبان سے کہتا رہے یا دل میں کہے کہ میں یہ کام خدا کے لئے کر رہا ہوں۔

اسی طرح اس عمل کے بھی دو فائدے ہیں: دنیاوی اور معنوی' اگر دو فائدوں کے حاصل کرنے کے شوق سے عمل کیا جائے' اگرچہ زبان سے قُربَةِ اِلیٰ اللہ کہتا رہے وہ عمل بھی ریاکاری اور باطل پر مبنی ہے۔

یہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خلوص اور سچائی کے ساتھ نیت کرنے میں بھی کئی مراتب ہیں ان کا بیان کرنا موضوع سے خارج ہے۔

ارادے میں سچائی

جب ارادہ کیا کہ گناہ کو ترک کرتا ہوں یا نیکی کا کام کرتا ہوں تو اس عزم میں پختہ ہونا چاہئے' اگر تھوڑا سا بھی شک ہو تو ارادہ میں جھوٹا ہے کیونکہ ارادہ میں شک سچائی عزم کی ضد ہے۔ جس قدر اپنے عزم میں قوی ہوگا اس میں صدق بھی زیادہ ہوگا۔ مثلاً

اگر کسی نے ارادہ کیا کہ جب مجھے بیماری سے شفا ملی یا غربت ختم ہوئی اور دولت ملی تو فلاں کارخیر کروں گا۔ پس اس عزم میں یقین، راسخ اور قوی ہونا چاہئے۔

ارادہ سے وفا میں سچائی

یعنی عمل انجام دیتے وقت جو ارادہ کیا تھا اس میں سستی نہ کرے اور اپنے ارادہ پر عمل کرے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کا عزم کرتا ہے۔ اور اسی عزم میں صادق اور جری بھی ہوتا ہے، لیکن عین عمل کے انجام کے وقت میں غلبہ نفس، شہوت، کے غالب آنے سے اس کام میں سست ہونا ہے، بلکہ اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ اپنے عہد کو توڑ دیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو کاذبین میں شمار کرا دیتا ہے۔ جیسے خداوند متعال قرآن مجید میں اپنے عہد کی وفا کرنے والوں کی تعریف اور عہد توڑنے والوں کی مذمت فرماتا ہے:

رِجَالٌ صَدَقُوا مَاعَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ.

اپنے عزم سے وفا کا نمونہ

اصحاب حسین کا امام حسین علیہ السلام کے ساتھ عہد کر کے وفا کرنا ایسا عمل ہے کہ جو دنیا اور آخرت والوں کے لئے باعث عبرت ہے۔ عجیب تر یہ ہے کہ اتنی وفا تم کرنے کے بعد بھی امام سے پوچھتے تھے فرزند رسولؐ! کیا ہم اپنے عہد کے وفا کرنے میں سچے ہیں یا نہیں؟ جب سعید بن عبداللہ حنفی عاشورہ کے دن نماز ظہر کے وقت امام کے آگے کھڑا ہوا، اور ہر طرف سے تیر آ رہے تھے، اور یہ اپنے اوپر تیروں کو لیتا تھے۔ حتی کہ ۱۳ تیر اس کو لگے۔ خون کافی بہہ گیا۔ زمین پر گرے تو آخری وقت یہی کہا:

اُوفِيتُ فَقَالَ نعم. اَنْتَ اَمَامِی فِی الْجَنَّةِ..

"فرزند رسول! کیا میں نے وفا کی؟ آپ نے فرمایا بالکل، بلکہ

جنت میں مجھ سے آگے ہوگا۔''

کربلا والوں کے حالات و واقعات اہل ایمان کے لئے وفاداری اور عمل میں مکمل نمونہ ہیں۔ یعنی جن لوگوں نے جو عزم اور عہد کیا اس کو پورا کیا کہ انہوں نے خدا پرست ہونے اور خط رسول کی اتباع کر دی' تو کیا اپنے اس قول اور عہد پر قائم ہیں یا نفس و شیطان سے بھی سروکار رکھتے ہیں؟

باطن ظاہر سے بہتر ہو

یہ جو کہا جاتا ہے کہ ظاہر باطن ایک جیسے ہونے چاہئیں۔ تو پھر میں اپنے دعویٰ میں صادق ہوں گا تا کہ کوئی میرے بارے وہم و خیال نہ کرے کہ میرا باطن جو خراب ہے تو ظاہر کو بھی خراب کر دوں۔ تا کہ جھوٹا نہ بنوں۔ ظاہر و باطن ایک جیسے ہوں' یہ سوچ اور شیطانی فکر ہے۔ بلکہ واجب ہے کہ اپنے ظاہر کو اصلاح اور تقویٰ سے زینت دے بلکہ کوشش کریں کہ باطن ظاہر سے بہتر ہو۔ اگر باطن ظاہر سے بہتر ہوگا تو خدا مباہات کرتا ہے۔ جیسے کتاب جامع السعادات میں یہ روایت نقل ہوئی ہے۔

اِذَا سَاوت سَرِیْرَۃُ الْمُوْمِنِ عَلَانِیَتہٗ بَاھِیَ اللّٰہُ بِہِ الْمَلَائِکَۃَ یَقُوْلُ ھٰذَا عَبْدِیْ حَقًّا.

''جب مومن کا باطن و ظاہر برابر ہو گئے تو خدا ملائکہ سے مباہات کرتا ہے کہ دیکھ میرا بندہ صادق ہے۔''

ایک بزرگ فرماتے تھے:

''کوئی ایسا شخص مجھے دکھایا جائے جس کی آنکھیں رات کی تاریکی میں بھی آنسو بہاتی ہوں اور دن کو محافل میں لبوں پر مسکراہٹ بھی ہو۔''

اس میں شک نہیں کہ جس عمل میں ملاوٹ ہو اس کا ظاہر خوبصورت سجا ہوا ہو اور اس کا باطن ظاہر کی طرح نہ ہو، تو وہ عمل اس کے مالک کو واپس کر دیا جائیگا۔

گفتار و کردار ایک ہونا چاہیئے

ظاہر و باطن کے برابری کے مصادیق کردار و گفتار میں برابری ہے۔ جو کہتا ہے اس پر عمل بھی کرے ورنہ جھوٹا ہوگا۔ اور خدا کی طرف سے توبیخ ہوگی۔ جیسے قرآن حکیم نے فرمایا:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ.

''لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لِمَا تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَعْلَمُوْنَ.

''اے ایمان والو! جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہو، اور اللہ کے غیض و غضب کے لئے سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہو۔''

حضرت امام صادق فرماتے ہیں:

''خدا نے جن علماء کی قرآن میں تعریف کی ہے وہ اہل بہشت ہیں۔ جن کے اعمال ان کی گفتار کی تصدیق کرتے ہیں یعنی ان کا کردار ان کی گفتار پر شاہد ہے۔ اور جس کا کردار اس کے اقوال کی تصدیق نہ کرے تو وہ قطعاً عالم نہیں۔''

مفضل کہتا ہے کہ میں امام جعفر صادقؑ کی کے خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مولا! نجات پانے والا کس چیز سے پہچانا جائے گا؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

''جس کا کردار اس کی گفتار کا موافق ہو گا' اس کی نجات کی قطعی گواہی ہے اور جو ایسا نہیں اس کا ایمان عارضی اور مضطرب ہے۔''

یہ پانچویں قسم بہت اہم ہے۔ یعنی ظاہر و باطن کا برابر ہونا تمام صدق کی اقسام سے قیمتی اور اعلیٰ ہے اور یہ سخت مقام ہے' خدا سے یہ مقام بغیر تضرع اور سعی کے حاصل نہ ہو گا۔

بس اب کیا کریں؟

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر کسی کا باطن اور ظاہر برابر نہ ہو تو اس کا عمل لغو اور بے فائدہ ہو گا۔ جیسے بدن بے جان ہوتا ہے۔ تو پھر اس لئے عمل کو ترک کرنا ہی بہتر ہے۔ نماز اس حالت میں پڑھنا کہ جب دل بوجھ محسوس کر رہا ہو' یعنی قلب حاضر نہ ہو تو اس نماز کا کیا فائدہ؟ یا اس ذکر کا کیا فائدہ کہ جب وہ حقائق سے غافل ہو' اس دعا و مناجات کا کیا فائدہ جب دل دنیا کے لئے سرگرم ہو؟ اور اپنے آپ کو احتجاج' مضطر نہیں سمجھتا تو اس کا کیا اثر ہے؟ اسی طرح خوف خدا میں رونا اور امام حسین کے غم میں رونا جبکہ باطن میں غم وحزن نہیں ہے تو رونے کا کیا فائدہ؟ یہ ریاکاری ہے تصنع ہے لہٰذا ایسے عمل کا کیا فائدہ؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان اعمال ظاہری کو ترک نہ کرے تا کہ باطن کے برابر ہو جائے؟

ہم جواب عرض کرتے ہیں۔ کہ انسان کو ظاہری اعمال (نماز و روزہ) کو کبھی ترک نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کوئی انتظار کرے کہ اس کا دل آمادہ ہو جائے تو پھر وہ اعمال بجالائے تو اس طرح وہ سب اعمال سے محروم ہو جائے گا۔ بلکہ سعی کرے اور عمل کو شروع

کر دے اور خدا سے دعا مانگے کہ خدایا! میرے ظاہر و باطن کو موافق فرما دے اور یقین رکھیں کہ خدا ہر کمزور کا مددگار ہے۔ اور عمل کے دوران حالت حضور نصیب ہو جاتی ہے۔

اگر دس میں سے ایک نماز قبول ہو جائے

اگر عمل کا ایک جز بھی باطن کے موافق ہو گیا تو نتیجتاً عمل قبول ہو گا۔ نماز کے متعلق خصوصی روایت ہے کہ اگر نماز کے دسویں حصہ میں بھی حضور قلب ہو جائے تو نماز قبول ہو جاتی ہے۔ ایسی نماز بھی بہت کم ہو گی کہ جس میں اس قدر بھی حضور قلب نہ ہو۔

بہرصورت عمل کو ترک کرنا اس شیطانی وسوسے کی وجہ سے فائدہ مند نہیں ہے۔ شیطان تو چاہتا ہے کہ وہ انسان کو اعمال خیر سے محروم کر کے بدبخت کر دے، وہ یہی وسوسہ ڈالتا ہے کہ تیرے عمل کا کیا فائدہ جب ظاہر و باطن ایک نہیں؟ شیطان سے کہو کہ بے شک میرا عمل مجاز ہے، اسی مجاز کو کروں گا۔ خدا قادر ہے کہ مجھے اہل حقیقت بنا دے۔

دوسرا میرا خدا کریم ہے۔ میرے عیوب و نقائص کو ملاحظہ نہ فرمائے گا۔ چشم پوشی سے کام لے گا، بلکہ میری عجز اور بیچارگی پر رحم کرے گا۔ اور مجھے محروم نہ کرے گا۔

الٰہی! تو نے کہا کہ میں کریم ہوں مجھے پوری امید ہے کہ تیرا کرم میرے شامل حال رہے گا۔ اور ناامیدی حرام ہے۔

ہر وہ چیز جو دل پر گذرتی ہے اور ہر وہ حرف جو زبان سے سنا جاتا ہے، اس کے نتیجے میں کار خیر کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ترک خیر والا مشورہ شیطانی ہے۔ خدا ہم سب کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔

دینی معاملات میں سچائی

چھٹی قسم مقامات دینی اور صفات کمال انسانی میں سچائی ہے۔ جیسے یقین، صبر،

شکر، خوف، رجا، توکل، حب، زہد، رضا اور تسلیم، اگر کوئی ان تمام کے حقائق سے آشنا ہو اور ان کے لوازم و آثار سے واقفیت رکھتا ہو تو وہ صدیق ہے۔ ان مقامات میں کذب یہ ہے کہ ان صفات کے آثار اور لوازم اس کے گفتار اور کردار میں نہ ہوں۔ ہم یہاں پر سب کی تشریح تو نہیں کر سکتے۔ البتہ صرف صدق در یقین کی بات کرتے ہیں۔

یقین صادق و کاذب

یقین ایسے علم کو کہتے ہیں کہ جس کے خلاف کوئی احتمال نہ ہو، اور اس میں کسی قسم کا شک و تردد نہ ہو۔

یقیناً صادقاً

یقین کی دو قسمیں ہیں۔ یقین صادق اور یقین کاذب جیسے ہم دعا میں پڑھتے ہیں

خدایا مجھے یقین صادق عطا فرما!

یقینِ صادق وہ ہے جس کی طاقت کے ذریعے اس کے آثار ظاہر ہوں۔ اور یقین کاذب وہ ہے جس کے کمزور ہونے کی وجہ سے (قوہ واھمیہ کے غلبہ کی وجہ سے) ایک خشک لکڑی کے برابر حرکت نہیں ہوتی۔ جیسے بند کمرے میں کسی مردے سے ڈرنا، حالانکہ اس شخص کے زندہ ہوتے وقت اس سے نہ ڈر آتا تھا نہ خوف لیکن اب بے روح بدن سے ڈر رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہتے ہیں کہ انسان پر وہم کی قوت غالب ہے جو اسے یقین نہیں کرنے دیتی۔

یہی حال دینی امور میں یقین کاذب کا ہے۔ جیسے کسی کو یقین ہے کہ روزی خدا دیتا ہے تو پھر وہ روزی پر نالاں اور پریشان کیوں ہوتا ہے؟ دن رات ہاتھ پاؤں

مارتا ہے۔ کئی سالوں تک اس کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ آئندہ کیا ہوگا؟ روزی کیسے پوری ہوگی؟ کتنا کام کرتا رہوں گا؟ حالانکہ جانتا ہے کہ خدا نے جس کو دانت دیئے اس کو کھانا بھی دے گا۔

اگر یقین رکھتا ہے کہ تمام امور قضا و قدر مشیت ایزدی سے ہوتے ہیں۔ تو اس کا صبر، رجا، تسلیم اور توکل کہاں جاتے ہیں؟ قضا و قدر کی امید پر یقین کا یہ مفہوم ہے کہ جس کو مرنے کا یقین ہے وہ تو ہر لحظ موت کا منتظر رہتا ہے تو پھر اتنا حرص، لالچ، طمع، دشمنی اور فساد کس لئے کرتا ہے یہاں پر حضرت امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں:

مَارَأَیْتُ یَقِیْنًا لَاشَکَّ فِیْهِ اَشْبَهَ بِشَکٍّ لَا یَقِیْنَ فِیْهِ مِنَ الْمَوْتِ.

''میں نے ایسا کوئی یقین نہیں دیکھا کہ جس میں شک نہیں، جو ایسے شک کے مشابہ ہے جس میں ذرا یقین نہیں، صرف یہی موت کا یقین ہے۔''

یعنی لوگوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو موت میں شک ہے اس پر یقین نہیں، اگر مخلوق کے حالات کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کے عمل اس شخص کی طرح ہیں جس کو یقین ہے کہ موت نہ آئے گی۔ اور ہمیشہ اس دنیا میں رہیں گے۔

جو شخص قیامت کے حساب و کتاب کے دن پر یقین رکھتا ہے کہ ذرا ذرا کی بھی پرسش ہوگی۔ اس کے یقین کا ثبوت یہ ہے کہ گفتار و گردار میں بہت احتیاط کرے اور اللہ کے عذاب سے ڈرے۔

خدا سے ڈرنا ایمان کی نشانی ہے

روایت میں ہے کہ ایک عربی النسل دیہاتی شخص نے قبول اسلام کے بعد سورۂ زلزلہ کو یاد کرلیا اور

اس نے کہا کہ مجھے یہی کافی ہے۔ اس نے پھر رسول خدا سے پوچھا:

''کیا ذرے ذرے کا حساب ہو گا وہاں دیکھا جائے گا؟''

آپؐ نے قرآن مجید کی اس مشہور آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ.

''تو اس عربی نے چیخ ماری اور کہا:

''وافضیحتا''

رسولِ پاکؐ نے فرمایا: اس اعرابی کا دل نور ایمان سے منور ہو گیا ہے۔''

یعنی اس کی ڈرنے کی یہ حالت گواہ ہے کہ اسے قیامت کا یقین بھی ہے اور نور ایمان سے اس کا دل بھی منور ہو گیا ہے' مختصراً خلاصہ یہ ہے کہ ایسے سوالات بہت زیادہ ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے' کہ ہمارا کیا ان امور پر اعتقاد اور یقین ہے یا نہیں؟ اگر یقین نہیں تو کافر ہو جائے گا۔ اور اگر یقین ہے تو اس یقین کے آثار اور لوازم کہاں ہیں؟ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ اعتماد تو ہے لیکن روحانی جذبہ کمزور ہونے کی وجہ سے جذبہ حیوانی کی قوت کا غلبہ ہے لہٰذا اعتقاد کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ اہلِ اعتقاد بھی اتنا کمزور ہے کہ زوال کے قریب ہے۔ کیونکہ جب روحانیت کمزور ہو جائے۔ تو حیوانیت غالب آجاتی ہے' اور پھر اعتقاد اور یقین باقی نہیں رہتے' تو پھر ایسی کیفیت میں انسانی حیوان کی طرح بلکہ ان سے پست تر ہو جاتا ہے۔

اُولٰئِکَ کَالَا نْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ.

کیونکہ دوسرا کوئی دل نہیں ہے کہ جو سمجھے اور نور ایمان کو اخذ کرے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا. اَمْ عَلٰى قُلُوب اَقفالَهَا.

پس ہم مجبور ہیں کہ جذبۂ روحانیت کو تقویت دیں اور یہ روحانیت کے مواعظ کو زیادہ سننے، دوسرے عالم کو زیادہ یاد رکھنے، شہوانی جذبہ کو کم کرنے، روحانی افراد کے قریب ہونے اور مادی افراد و مجالس سے دور رہنے سے ہوگا۔

متقی خدا کے قرب و جوار میں ہیں

تیسری چیز جس پر زیادہ توجہ کرنا ہے "عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ." کمیت قدرتمند کے پاس ہے۔

کلمہ عند کے معنی قرب کے ہیں۔ قرب بمعنی نزدیکی ہے۔ قرب کی دو قسمیں ہیں۔ قرب مکانی ہے یا معنوی یعنی ایک جسم دوسرے جسم کے قریب ہے، تو یہ قرب مکانی ہوگا اور قرب معنوی و روحانی یہ ہے کہ اصلاً جسم و مکان سے ربط بھی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں قرب بمعنی مکان نہیں بلکہ بحیثیت منزلت ہے۔ اہل تقویٰ خدا کے پاس ہیں۔ اس کا نعوذ باللہ یہ معنی نہیں کہ خدا کسی جگہ بیٹھا ہے اور اہل تقویٰ اس کے قریب بیٹھے ہے۔ بلکہ درجہ اور مقام کے لحاظ سے قریب ہیں یعنی اہل تقویٰ خدا کے نزدیک مقرب، عزت والے، صاحب شان اور مورد نظر عنایت ہیں۔

قرب روحانی کی اہمیت

زیادہ اہم چیز قرب روحانی ہے۔ حضرت عائشہ قربِ جسمانی و مکانی کے لحاظ سے پیغمبر کے زیادہ قریب تھی، لیکن یہ اس کے لئے کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ ابوجہل،

ابولہب سب پیغمبر کے قریب تھے لیکن بے فائدہ۔ قرب بہ صحابیت اور زوجیت فائدہ مند ثابت نہ ہو سکی کیونکہ معنوی طور پر ہزاروں فرسخ دور تھے۔ اویس قرنیؒ ظاہری طور پر ہزاروں فرسخ دور تھا۔ یمن میں رہتا تھا۔ زندگی میں پیغمبرؐ کی زیارت بھی نہ کی' لیکن معنوی اور روحانی طور پر اس قدر پیغمبر کے قریب تھا کہ جب ہزاروں فرسخ سفر کرکے پیغمبرؐ کی زیارت کو آیا اور زیارت نہ ہوئی تو واپس چلا گیا۔ جب پیغمبرؐ گھر تشریف لائے' تو دیکھا کہ ایک نور ظاہر ہے۔ یا دوسری روایت کے مطابق آپ کو بہشت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اور پوچھا: کون آیا تھا؟ بتایا گیا کہ ایک اویس نامی شخص آیا تھا۔ فرمایا اویس آیا اور ہمارے گھر میں نور چھوڑ گیا۔ میرے فوت ہونے کے بعد وہ یہاں آئے گا' جو بھی اس کو دیکھے میرا اسلام کہہ دینا۔ وہ قیامت کے دن اس عظمت کے ساتھ محشور ہو گا کہ خدا اس کی شفاعت سے عرب کے دو بڑے قبیلوں ''مضر'' اور ''ازد'' کے جانوروں کے جسموں کے بالوں کے برابر افراد کو نجات دلائے گا۔

ہمارا مقصد قرب معنوی کی طرف اشارہ کرنا ہے' نہ قرب مکان کی طرف ورنہ اویس کے حالات مفصل ہیں۔ بالاخر وہ جنگ صفین میں امیر المومنینؑ کی طرف سے جنگ میں شامل ہوئے اور ان کو شہادت نصیب ہوئی۔ ان کا روحانی قرب پیغمبر کے ساتھ عرب میں ایک ضرب المثل بن گیا۔ '' اگرچہ یمن ہے لیکن میرے ساتھ ہے سبزا میرے سامنے ہے۔''

ممکن ہے کہ یہ بشر اس قدر قرب خداوندی پیدا کرے کہ کوئی ملک مقرب بھی وہاں نہ پہنچ سکے۔

دوست کے نزدیک دوست

تفسیر ابو الفتوح رازی اور منہج الصادقین میں اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث ذکر کی گئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر مناجات کے لئے جا رہے تھے کہ آپ نے ایک فقیر کو دیکھا کہ ایک طرف پڑا ہوا ہے۔ اپنی شرمگاہ کو چھپائے ہوئے ہے اور مناجات کر رہا ہے۔ اور مسلسل کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار میں تنہا ہوں بے سہارا ہوں، فقیر اور محتاج ہوں۔

جب موسیٰ علیہ السلام مناجات کو آئے: تو آواز آئی: اے موسیٰ علیہ السلام واپس جا کر تو اس فقیر کو میرا سلام کہہ، اور پھر اسے کہنا کہ تو تنہا نہیں میں تیرا انیس ہوں جو تو چاہتا ہے مجھ سے مانگ، میں تیرا وکیل ہوں۔

جب موسیٰ ؑ نے پیغام دیا، تو اس نے کہا اے موسیٰ! میرے رب العالمین خدا نے مجھے سلام کیسے بھیجا؟ میں بدبخت، عاجز اس قابل ہوں کہ خدا مجھے میرے رونے کا جواب عنایت فرمائے؟ عاشق خدا نے چیخ ماری اور فوت ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اس کی تشییع جنازہ کی اطلاع دی لیکن جب وہ آئے تو جنازہ غائب تھا۔

حضرت موسیٰ ؑ نے عرض کی کہ پروردگارا! تیرے اس بندے کا جنازہ کہاں ہے؟ تو آواز آئی: کہ دوست اپنے دوست کے پاس ہے۔ یعنی فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ. پسندیدہ مقام پر ہے۔

محبان علیؑ کا مقام

تفسیر منہج میں ثعلبی (جو سنی مفسر ہے) سے نقل کیا گیا ہے کہ جابر سے روایت

ہے کہ اس نے کہا:

''ایک دن رسول پاکؐ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ سے بعض اصحاب نے بہشت کے حالات پوچھے۔ تو حضرتؐ نے فرمایا: خدا کا ایک علَم نوری ہے جس کا عمود زبرجد کا بنا ہوا ہے' اللہ تعالیٰ نے جس کو آسمانوں اور زمین کی خلقت سے ۲ ہزار سال پہلے پیدا کیا۔ اس کے پھریرے پر لکھا ہے لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ و آل محمد خیر البریۃ صاحب اللواء امام القوم یعنی علَم دار کائنات حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔ جب حضرت علی علیہ السلام نے یہ سنا تو عرض کیا: ''خدا کا شکر ہے کہ ہمیں آپ کی طرف ہدایت کر دی گئی' اور ہمیں مکرم' مشرف فرمایا کیا تو اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا: یا علیؑ! جو ہم سے محبت رکھتا ہے' اور ہماری طرف محبت کی نسبت دیتا ہے تو خدا اس کو ہمارے ساتھ والے درجہ میں رکھے گا' وہ ہمارا ساتھی اور دوست ہوگا۔ پس آپ نے اس آیت کی فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر کی تلاوت فرمائی۔

ملیک مقتدر

مختصراً آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اہل تقویٰ تمام لوگوں سے پسندیدہ ہیں اور حضرت ملک الملوک اور سلطان السلاطین کے مقرب درگاہ ہیں!

''ملیک'': مبالغہ کا صیغہ ہے ایسا بادشاہ جو کسی مخلوق کا محتاج نہیں' تمام مخلوق ہر حال میں اس کی محتاج ہے۔ ''مقتدر'' یہ قادر کے مبالغہ صیغہ ہے۔ یعنی ہر چیز پر قدرت رکھنے والا' عجز و ناتوانی محال ہے۔

ان دو مبارک ناموں (ملیک' مقتدر) کا ذکر کے مقربین کے مقام بلند کی

طرف اشارہ کیا گیا ہے اگر چہ اس مجازی دنیا میں اگر کوئی سلطان کا مقرب ہو تو اس کی قدرت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور جو اس کی مرضی آئے کرتا ہے' اس طرح لوگ اس سے غبطہ یا حسد کرتے ہیں۔ اسی طرح اہل تقویٰ بھی آخرت میں ہمیشہ اپنی اصلی جگہ میں اللہ کی بے حد قدرت سے فائدہ اٹھائیں گے' جو چاہیں گے وہ ہو جائے گا۔ جس طرح قرآن مجید میں واضح حکم ہے:

لَهُمْ مَا يَشَاءُ و نَ عِنْدَ رَبِّهِمْ.

اھل تقویٰ کی سلطنت اور حکمرانی کی عظمت و رفعت اس دنیا میں قابل درک نہیں اور اہل تقویٰ کی آخرت میں سلطنت و بزرگی کے نمونے جاننے کے لئے قرآن مجید کو دیکھیں۔ معجزات' خوارق عاداتِ انبیاء کرام' اولیاء و صالحین اور دوستان خدا کی روایات کتب میں نقل ہوئی ہیں۔ کہ ان تمام مقربان درگاہ کے ہاتھوں قدرت الٰہی کا ظہور ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو قدرت خدا انبیاء کے لئے تھی تو یہ عمومی طور پر بہشت بریں میں اہل تقویٰ سے منسوب ہے۔ ان کے لئے یہی قدرت ہو گی۔ جس قدرتِ الٰہی کا ظہور اہل تقویٰ کے ہاتھوں سے ہو گا۔

❁	فکر حسینؑ اور ہم		15
❁	پیامِ عاشورہ		40
❁	معصومین کی کہانیاں		35
❁	ارشادات مصطفیٰؐ و مرتضیٰؑ		35
❁	آزادی مسلم		10
❁	فقہ اہل بیتؑ		55
❁	صحیفہ پنجتنؑ		100
❁	حرفِ احساس		100
❁	حسینؑ میرا		100
❁	جام غدیر		150
❁	زندہ تحریریں		100
❁	شاہکار رسالتؐ		60
❁	محشر خاموش		130
❁	اسلام اور کائنات		200
❁	غریب ربذہ		120
❁	فطرت		125
❁	جستجوئے حق		50

اشاعتی عزائم

❁	نقوش محسن		
❁	کربلا میں اصحاب کا کردار		
❁	چودہ ستارے (جدید)		
❁	سردار کربلا		
❁	نہر المصائب (۵ جلد)		
❁	بحر المصائب		
❁	معالم المدرستین (۳ جلد)		
❁	علیؑ کے مشہور فیصلے		
❁	علیؑ کی مشہور جنگیں		
❁	بیت الحزن		
❁	سوال کیجیے جواب لیجیے		